ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

انقلاب آفریں شخصیت (ﷺ)

''اگر کوئی واحد ہستی ایسی ہے جس کے متعلق وثوق سے کہا جا سکے کہ اس نے حقیقتاً تاریخ کا رخ موڑ دیا ہے، جس نے انسان کو جہالت کے بجائے علم، فرسودہ روایات کے بجائے تعقل اور آباء واجداد کے نقش قدم کورانہ پیروی کے بجائے عقل وبصیرت اور تفکر وتدبر سے کام لینے کا عادی بنایا ہے تو وہ ذات گرامی حضور اکرم ﷺ کی ہے، آپ ﷺ تاریخ کے اس دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں جہاں سے عقل واستدلال اور توہم پرستی کے راستے جدا ہوتے ہیں، آپ کی تعلیمات نے انسان کو عقل کی روشنی عطا کی اور اس کی مبصرانہ صلاحیتوں کو جلا بخشی۔''

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

₹10/-

مرکز الإمام أبی الحسن الندوي

دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

DEC 2017

حالات کیوں کر بدلتے ہیں!

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ

''اسپین کا المیہ جو پیش آیا اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، اس میں ایک بات بہت نازک یہ ہے کہ وہاں علوم دینیہ کی بھی خدمت کی گئی اور وہاں خدا تک پہنچنے کے لیے ایسے ایسے مجاہدے ہوئے جن سے چوٹی کے اولیاء پیدا ہوئے، بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مشرق اگر انبیاء کی سرزمین ہے تو مغرب اولیاء کی سرزمین ہے، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی جیسے جلیل القدر مشائخ پیدا ہوئے، اسی طریقہ سے فنون لطیفہ کو بھی وہاں بہت ترقی ہوئی، اندلس کا ایک مستقل ادبی دبستان ہے، اس کو ''المدرسة الأندلسية'' کہتے ہیں، اسی طرح چوٹی کے مصنفین پیدا ہوئے، موفقات کے مصنف علامہ شاطبیؒ پیدا ہوئے، ابن عبد البر پید اہوئے، ایسے ہی بہت سی کتابوں کے مصنف پیدا ہوئے اور مؤطا کی ایسی شرحیں لکھی گئیں، لیکن ایک چیز سے اغماض برتا گیا وہ یہ کہ وہاں کی اصل آبادی کو جو آٹے میں نمک کے برابر تھی، اپنی پوری سلطنت واقتدار کے باوجود سنجیدگی کے ساتھ اسلام سے مانوس کرنے اور اسلام کے دائرے میں داخل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، اس لیے کہ اقتدار میں اکثر یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہمارے نام اس زمین کا پٹہ لکھ دیا گیا ہے، مغلیہ سلطنت کی فرامین میں یہ لفظ ملتا ہے کہ ''دولت ابد برقرار'' یعنی ہم براہ راست حضرت اسرافیل کو اس ملک کا چارج دیں گے اور اس وقت تک کوئی خطرہ نہیں ہے، یہ اس کا غلط خیال تھا، اس پھیلی ہوئی آبادی کو اپنے حال پر چھوڑ دینا اور اس کے جذبات کو غلط تعلیم کے ذریعہ، غلط تاریخ کے ذریعہ، اپنی اخلاقی کمزوریوں کے ذریعہ اس سے بڑھ کر مقابل سیاسی تحریکوں کے ذریعہ نشو ونما پانے کا موقع دینا بہت خطرناک ہے۔ ہندوستان میں تو یہ عنصر زیادہ واضح طور پر ہے، مسلمانوں نے ہندوستان پر آٹھ سو سال تک علی الرغم حکومت کی ہے، اور جب اخیر میں تصادم اور متصادم سیاسی تحریکیں چلی ہیں اور انہوں نے غیر مسلموں کے دل میں بڑے بڑے ناسور پیدا کر دیے ہیں، اب اس کو پیام انسانیت کے ذریعہ ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔''

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں ایک ساتھ شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۹ | دسمبر ۲۰۱۷ء - ربیع الاول ۱۴۳۹ھ | شمارہ: ۱۲

سرپرست: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ (صدر، دارعرفات)

نگراں: مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ (جنرل سکریٹری، دارعرفات)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمود حسن حسنی ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

شان امتیازی

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾

(اے ایمان والو! اگر تم اللہ کا لحاظ رکھو گے تو وہ تمہیں ایک امتیاز عطا فرمائے گا اور تمہارے گناہوں پر پردہ ڈال دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ تو بڑے فضل والا ہے)

(الأنفال: ۲۹)

فی شمارہ: -/Rs.10 | Mail: markazulimam@gmail.com | سالانہ زرتعاون: -/Rs.100

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر "پیام عرفات" مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فہرس

چمنستان عالم کی بہار (اداریہ).....۳

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

سیرت محمدی کا پیغام-موجودہ دور کے مسلمانوں کے نام..۴

.....حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام.....۶

.....حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

تقوی وپرہیزگاری.....۸

.....مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

توحید کیا ہے؟.....۱۰

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

مدینہ کے منافقین.....۱۲

.....عبدالسبحان ناخدا ندوی

مسافر کی نماز.....۱۴

.....مفتی راشد حسین ندوی

علم دین کی اہمیت ونافعیت.....۱۷

.....محمد ارمغان بدایونی ندوی

مسلم نسل کشی کا اندلسی ماڈل.....۱۸

.....محمد نفیس خاں ندوی

میں تو اس قابل نہ تھا

نتیجۂ فکر:- حضرت سید شاہ نفیس الحسینیؒ

شکر ہے تیرا خدایا، میں تو اس قابل نہ تھا
تو نے اپنے گھر بلایا، میں تو اس قابل نہ تھا

اپنا دیوانہ بنایا، میں تو اس قابل نہ تھا
گرد کعبہ کے پھرایا، میں تو اس قابل نہ تھا

مدتوں کی پیاس کو سیراب تو نے کردیا
جام زمزم کا پلایا، میں تو اس قابل نہ تھا

ڈال دی ٹھنڈک مرے سینے میں تو نے ساقیا
اپنے سینے سے لگایا، میں تو اس قابل نہ تھا

بھا گیا میری زباں کو ذکر الا اللہ کا
یہ سبق کس نے پڑھایا میں تو اس قابل نہ تھا

خاص اپنے در کا رکھا تو نے اے مولا مجھے
یوں نہیں در در پھرایا، میں تو اس قابل نہ تھا

میری کوتاہی کہ تیری یاد سے غافل رہا
پر نہیں تو نے بھلایا، میں تو اس قابل نہ تھا

میں کہ تھا بے راہ، تو نے دست گیری آپ کی
تو ہی مجھ کو رہ پہ لایا، میں تو اس قابل نہ تھا

عہد جو روز ازل تجھ سے کیا تھا یاد ہے
عہد وہ کس نے نبھایا، میں تو اس قابل نہ تھا

تیری رحمت، تیری شفقت سے ہوا مجھ کو نصیب
گنبد خضرا کا سایہ، میں تو اس قابل نہ تھا

میں نے جو دیکھا سو دیکھا جلوہ گاہ قدس میں
میں نے جو پایا سو پایا، میں تو اس قابل نہ تھا

بارگاہِ سید کونین میں آکر نفیسؔ
سوچتا ہوں کیسے آیا؟ میں تو اس قابل نہ تھا

مدیر کے قلم سے

چمنستان عالم کی بہار

بلال عبدالحی حسنی ندوی

لاکھ آنکھیں بند کی جائیں اور تاریخ کو مسخ کرنے کی کوششیں کی جائیں، لیکن دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے خوب جانتے ہیں کہ آج سے پندرہ صدی پہلے دنیا کیا تھی، لگتا تھا کہ جانوروں کی آماجگاہ ہے، اس وقت کا تمدن ایک سڑے ہوئے لاشہ کی طرح تھا، جس کی بدبو سے ہر انسان پریشان تھا، ہر طاقتور شکاری اور ہر کمزور شکار تھا، انسانیت کی تاریخ میں عورت کو کبھی اتنا بے حیثیت نہ سمجھا گیا تھا، اس وقت نہ ماں ماں تھی، نہ بیوی بیوی، عورت کو ایک جانور سمجھ لیا گیا تھا، راہ ومنزل سے بے خبر وہ دردر ٹھوکریں کھانے پر مجبور تھی، حاصل یہ کہ زندگی کی گاڑی ایک ایسی ڈھلوان پر پڑ چکی تھی جس کے آگے ایسی گہری کھائی تھی کہ بچاؤ کی صورت نظر نہ آتی تھی، جہالت کی گھٹاٹوپ اندھیریاں تھیں، جہاں امید کی کوئی کرن نہ تھی۔

ان مایوس کن حالات میں حضرت عبداللہ کے گھر بی بی آمنہ کے یہاں آفتاب رسالت طلوع ہوا، در یتیم کی پیشانی سے تجلی حق کا نور ظاہر تھا، بچپن سے جوانی تک اس صادق وامین کی پاکیزہ زندگی ہر ایک کے لیے نمونہ تھی، پچیس سال کی عمر مبارک تھی کہ حضرت خدیجہ جیسی زیرک پاکباز خاتون نے نکاح کی فرمائش کی، جسے آپ ﷺ نے اپنے چچا کے مشورہ سے قبول فرمایا۔

چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی، اس کی کرنیں دنیا میں پھیلنے لگیں، ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ کے اولین فرمان رب نے دنیا کو علم و قلم کی وہ لازوال دولت بخشی جس نے جہنم کدہ دنیا کو جنت نشاں بنادیا، علم کے دریا رواں ہوئے، ظلم وبربریت نے دم توڑا، انسانوں کو انسانیت کی بلندی ملی، اپنے رب کی پہچان ملی، مساوات انسانی کا سبق ملا، عورتوں کو آزادی ملی اور شرم وحیا کا زیور ملا، ماں باپ کو خدا اور رسول کے بعد سب سے بڑا درجہ ملا، اہل خاندان کے ساتھ صلہ رحمی کو عمر اور رزق میں برکت کا ذریعہ بتایا گیا، پڑوسی کے ساتھ سلوک کو ایمان کی علامت قرار دیا گیا، خادموں کے ساتھ نرمی کی تاکید کی گئی، بیوہ ویتیم کے ساتھ ہمدردی وغم خواری کو مغفرت کا راستہ بتایا گیا، مریض کی عیادت کو رحمت کا دریا بتایا گیا، یہاں تک کہ جانور کے ساتھ بھی بہتر برتاؤ کرنے کا حکم دیا گیا، پودوں اور درختوں کا بھی حق بتایا گیا اور یہاں تک کہہ دیا گیا کہ زمین پر اکڑ کر مت چلو، پیر پٹخ پٹخ کر مت چلو، زمین کا بھی حق ہے۔

شجر وحجر کو یہ حق کس نے دیا، کمزوروں کو گلے کس نے لگایا، وہ کس ذات کی آمد تھی کہ باغ عالم کی کلی کلی مسکرانے لگی؟؟

رحمت عالم ﷺ کی یہ امانت سراپا رحمت رحمۃ للعالمین کی امت کے سپرد ہے، آج اس امت نے اس کو فراموش کردیا، زندگی کا رخ بدل گیا، نتیجہ یہ ہے کہ قوموں کا رخ بدل گیا، جو آب حیات انسانیت کی زندگی کے لیے ضروری تھا، جس چشمہ حیواں سے باغ انسانیت ہمیشہ سیراب ہوتا رہا، انسانیت کے دشمن چند لوگ اسی کو خشک کرنے میں لگے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ امت اس کی حقیقت اور ضرورت اپنے قول وعمل سے دنیا کے سامنے پیش کرے، اور دنیا بھی اپنی بند آنکھوں کو کھول کر اس حقیقت کو دیکھے کہ ؎

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے — یہ سب پود انہیں کی لگائی ہوئی ہے

اس رحمت عالم ﷺ کے بارے میں آج مغربی میڈیا کیا پیش کرنا چاہتا ہے اور اس کی لے میں لے ملانے والے کہاں کہاں ہیں، اور ان کا مقصد کیا ہے، کس طرح طلوع آفتاب کو ظلمت شب بتانے کی ناکام کوششیں جاری ہیں، کوئی غور کرے اور سوچے دنیا کو کس مہیب غار میں ڈھکیلنے کی تیاری ہے، کوئی خود اپنے پیر پر کلہاڑی چلائے، ایک انسان انسانیت کے محسن اعظم ﷺ کے بارے میں منفی سوچ پیش کرے، سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ ع خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام

موجودہ دور کے مسلمانوں کے نام

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

سب جانتے ہیں کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، دنیا کچھ ویران اور کوئی قبرستان نہ تھی، زندگی کا چکر جس طرح اس وقت چل رہا ہے، بہت تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس وقت بھی چل رہا تھا، سارے کاروبار آج کی طرح ہو رہے تھے، تجارت بھی تھی، زراعت بھی تھی، اور حکومتوں کا نظام چلانے والے اور ان کی مشنری میں فٹ ہونے والے بھی موجود تھے، اس وقت کی دنیا کے لوگ اس زندگی پر بالکل قانع اور مطمئن تھے، اور ان کو اس میں کسی ترمیم یا اصلاح یا تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنی زمین کا نقشہ اور دنیا کی یہ حالت بالکل پسند نہ تھی، حدیث میں اس زمانہ کے متعلق ہے: "ان اللہ نظر الی أهل الأرض فمقتهم عربهم و عجمهم الا بقايا من أهل الكتاب" (اللہ تعالیٰ نے اہل زمین پر نظر ڈالی، اس نے روئے زمین کے تمام باشندوں کیا عرب، کیا عجم سب کو بے حد ناپسند فرمایا اور وہ ان سے بے زار ہوا، سوائے اہل کتاب کے چند افراد کے)

ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک پوری قوم کے ظہور کا سامان کیا، ظاہر ہے کہ ان کو کسی ایسے مقصد کے لیے پیدا کیا تھا جو دوسری قوموں سے پورا نہیں ہو رہا تھا، جو کام وہ سب پورے انہماک اور شوق کے ساتھ انجام دے رہے تھے، اس کے لیے ظاہر ہے کہ کسی نئی امت کو پیدا کرنے کی ضرورت نہ تھی، اور انسانی زندگی کے اس پرسکون سمندر میں اس نئے تلاطم کی حاجت نہ تھی، جو مسلمانوں کے وجود سے ظہور میں آیا اور جس نے زمین میں ایک زلزلہ ڈال دیا، اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو فرشتوں نے عرض کیا کہ تسبیح و تقدیس کے لیے ہم نیاز مند بہت کافی ہیں، اس کے لیے اس خاکی پتلہ کو پیدا کرنے کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ گویا اشارہ فرمایا (اور آگے چل کر واضح کر دیا) کہ آدمؑ صرف اسی کام کے لیے پیدا نہیں ہوئے جو ملائکہ انجام دے رہے ہیں، ان سے خدا کو کچھ اور کام لینا ہے۔

اگر مسلمان صرف تجارت کے لیے پیدا کیے جا رہے تھے تو مکہ کے ان تاجروں کو جو شام و یمن کا تجارتی سفر کیا کرتے تھے اور مدینہ کے ان بڑے بڑے یہودی سوداگروں کو جن کے بڑے بڑے گڑھ بنے ہوئے تھے، یہ پوچھنے کا حق تھا کہ اس خدمت کے لیے ہم گنہگار کیا کم ہیں کہ اس کے لیے ایک نئی امت پیدا کی جا رہی ہے، اگر زراعت مقصود تھی تو مدینہ اور خیبر کے، طائف اور نجد کے، شام اور یمن اور عراق کے کاشت کاروں اور زراعت پیشہ آبادی کو یہ پوچھنے کا حق تھا کہ کاشتکاری اور زراعت میں ہم محنت و کوشش کا کون سا دقیقہ اٹھا رکھتے ہیں کہ جس کے لیے ایک نئی امت کی بعثت ہو رہی ہے، اگر دنیا کی چلتی ہوئی مشنری میں صرف فٹ ہونا تھا اور حکومتوں کے نظم و نسق اور دفتری کاروبار کو معاوضہ لے کر چلانا تھا تو روم و ایران کے کارپردازان سلطنت کو یہ کہنے کا حق تھا کہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے ہم بہت ہیں اور ہمارے بہت سے بھائی بے روزگار ہیں، اس کے لیے نئے امیدواروں کی کیا ضرورت ہے؟

لیکن درحقیقت مسلمان بالکل ہی ایک نئے اور ایسے کام کے لیے پیدا کیے جا رہے تھے جو دنیا میں کوئی نہ انجام دے رہا تھا اور نہ انجام دے سکتا تھا، اس کے لیے ایک نئی امت ہی کی بعثت کی ضرورت تھی، چنانچہ فرمایا: ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ﴾ (تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان لاتے ہو)

اسی مقصد کی خاطر لوگ وطن سے بے وطن ہوئے، اپنے کاروبار کو نقصان پہنچایا، اپنا عمر بھر کا اندوختہ لٹایا، اپنی جمی جمائی تجارتوں پر پانی پھیرا، اپنی کھیتی باڑی اور باغات کو ویران کیا، اپنے عیش و تنعم کو خیر باد کہا، دنیا کی تمام کامیابیوں اور خوش حالیوں سے آنکھیں بند کرلیں، اور زریں موقعے کھودیے، پانی کی طرح اپنا خون بہایا، اور اپنے بچوں کو یتیم اور اپنی عورتوں کو بیوہ کیا، ان مقاصد و مشاغل کے لیے جن پر آج مسلمان قانع نظر آتے ہیں، اس ہنگامہ آرائی اور اس محشر خیزی کی ضرورت نہ تھی، اس کے حصول کا راستہ تو بالکل بے خطر اور ہموار تھا اور اس راستہ پر معاصر دنیا سے کوئی بڑی کشمکش اور تصادم نہیں تھا، اور نہ یہ اہل عرب اور دنیا کی دوسری قوموں کے لیے وجہ شکایت تھی، انہوں نے تو بار بار انہیں چیزوں کی پیشکش کی (جو آج عام مسلمانوں کا منتہا ہے) اور ہر بار اسلام کے داعی نے ان کو ٹھکرادیا، دولت و سرداری، عیش و عشرت اور راحت و تن آسانی کی بڑی پیشکش کو نامنظور کیا، پھر اگر مسلمان کو اسی سطح پر آجانا تھا، جس پر زمانہ بعثت کی تمام کافر قومیں تھیں، اور اس وقت بھی دنیا کی تمام غیر مسلم آبادی ہے، اور زندگی کے انہیں مشاغل میں منہمک اور سرتاپا غرق ہوجانا تھا، جن میں اہل عرب اور رومی و ایرانی ڈوبے ہوئے تھے اور انہیں کامیابیوں کو اپنا منتہائے زندگی بنالینا تھا جن کو ان کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے بہترین موقع پر رد کرچکے تھے، تو یہ اسلام کی ابتدائی تاریخ پر پانی پھیر دینے کے مرادف ہے، اور اس بات کا اعلان ہے کہ انسانوں کا وہ بیش قیمت خون جو بدر و حنین و احزاب اور قادسیہ و یرموک میں بہایا گیا، بے ضرورت بہایا گیا۔

آج اگر سرداران قریش کو کچھ بولنے کی طاقت ہو تو مسلمانوں کو خطاب کرکے وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم جن چیزوں کے پیچھے سرگرداں ہو اور جن چیزوں کو تم نے اپنا حاصل زندگی سمجھ رکھا ہے، انہیں چیزوں کو ہم گنہگاروں نے تمہارے پیغمبر (علیہ الصلاۃ والسلام) کے سامنے پیش کیا تھا، وہ تمام چیزیں اس وقت خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر حاصل ہوسکتی تھیں، تو کیا ساری جد و جہد کا حاصل اور ان تمام قربانیوں کی قیمت وہ طرز زندگی ہے، جس کو تم نے اختیار کیا ہے اور زندگی و اخلاق کی وہی سطح ہے جس پر تم نے قناعت کرلی ہے، اگر ان سرداران قریش میں سے جو اسلام کے حریف تھے، کسی کو جرح کرنے کا موقع ملے تو آج ہمارا کوئی بڑے سے بڑا لائق وکیل بھی اس کا تشفی بخش اور مسکت جواب نہیں دے سکتا اور امت کے لیے اس پر شرمندہ ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے متعلق یہی خطرہ تھا کہ وہ دنیا میں پڑکر اپنا مقصد نہ بھول جائیں اور دنیا کی عام سطح پر نہ آجائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات کے قریب جو تقریر فرمائی اس میں مسلمانوں کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا: "ما الفقر أخشى عليكم ولكن أخشى أن تبسط عليكم الدنيا كما بسطت على من كان قبلكم فتنافسوها كما تنافسوها فتهلككم كما أهلكتهم" (بخاری و مسلم) (مجھے تمہارے بارے میں کچھ فقر و افلاس کا خطرہ نہیں ہے، مجھے تو اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا میں تم کو بھی وہی کشائش نہ حاصل ہوجائے جیسی تم سے پہلے لوگوں کو حاصل ہوئی، تو تم بھی اسی طرح اس میں حرص و مقابلہ کرو جیسے انہوں نے کیا تو تم کو بھی اسی طرح ہلاک کردے جیسے ان کو ہلاک کیا)

مدینہ کے انصاریوں نے جب اس بات کا ارادہ کیا کہ جہاد کی مشغولیت اور اسلام کی جد و جہد سے کچھ دنوں کی فرصت حاصل کرکے اپنے باغوں، کھیتوں اور کاروبار کو درست کرلیں اور کچھ مدت کے لیے صرف اپنے کاروبار میں مشغول ہونے کی اجازت حاصل کرلیں، یہ خطرہ بھی ان کے دل میں نہیں گذر سکتا تھا کہ وہ ارکان دین (نماز، روزہ، حج، زکاۃ) سے بھی کچھ دنوں کے لیے اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے اپنے آپ کو مستثنیٰ کرالیں، لیکن اسلام کی عملی جد و جہد اور دین کے فروغ اور اس کے غلبہ کی کوشش سے ان کی اس عارضی یکسوئی کو بھی خودکشی کا مرادف قرار دیا گیا اور سورۂ بقرہ کی یہ آیت نازل ہوئی جس کی تفسیر حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے اس طرح کی ہے:..... (باقی صفحہ نمبر/۹ پر)

حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

﴿وَدَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ.....
وَكُنَّا لَهُمْ حَافِظِينَ﴾(الأنبياء: ٧٨-٨٢)

(اور داؤد اور سلیمان کو دیکھو جب وہ دونوں کھیتی کے سلسلہ میں فیصلہ کررہے تھے، جس میں دوسرے لوگوں کی بکریاں پھیل گئی تھیں اور ہم ان کے فیصلہ کو دیکھ رہے تھے تو ہم نے اس (معاملہ) کو سلیمان کو سمجھادیا، اور ہم نے دونوں ہی کو سمجھداری اور علم سے نوازا، اور ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کردیا وہ اور پرندے (ان کے ساتھ) تسبیح کرتے تھے اور کرنے والے ہم ہی تھے، اور ہم ہی نے ان میں زرہ بنانے کی صلاحیت پیدا کردی تھی تاکہ وہ تمہاری جنگوں میں تمہاری حفاظت کرسکے تو کیا تم شکر ادا کرتے ہو، اور سلیمان کے لیے ہم نے تیز ہوا کو تابع بنادیا وہ ان کے حکم سے ان کو لے کر چلتی ہے، اس زمین کی طرف جس میں ہم نے برکت رکھی ہے، اور ان ساری چیزوں سے ہم بخوبی واقف ہیں، اور (ہم نے ان کے لیے تابع کردیا) ایسے شیطانوں کو جو ان کے لیے غوطہ لگاتے تھے اور ایسے عمل کرتے تھے جو ان کے لیے اس سے کم یا زیادہ کے تھے، اور ہم ہی ان کی حفاظت کرنے والے تھے)

ان آیات میں اللہ حضرت داؤد وحضرت سلیمان علیہما السلام کا ذکر کررہا ہے، اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں کی الگ الگ خصوصیات رکھی ہیں، حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبی ہونے کے ساتھ ساتھ مزید بادشاہت بھی دی تھی، صرف یہی نہیں بلکہ ان کو کاری گری کی صلاحیت بھی دی اور خاص سمجھداری عطا فرمائی۔

مذکورہ آیات میں ذکر ہے کہ ایک شخص حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس اچانک شکایت لے کر پہنچا، اور اس طرح پہنچا کہ حضرت داؤد علیہ السلام گھبرا گئے کہ یہ کون ہے؟ کہیں یہ ہمیں مارنے تو نہیں آیا؟ چنانچہ جب انہوں نے پوچھا کہ تم کیسے آئے؟ اس نے جواب دیا: ہم اپنا ایک مسئلہ لائے ہیں، اس کو حل کیجئے، مسئلہ یہ ہے کہ ہماری کھیتیاں تھیں، اور ان کھیتیوں کو فلاں لوگوں کی بکریاں چر گئیں، اب ہماری ساری دولت ختم ہوگئی، تو حضرت داؤد علیہ السلام نے فیصلہ دیا کہ اگر تمہارا اتنا نقصان ہوا ہے جتنا ان بکریوں کا فائدہ ہے تو ساری بکریاں تمہاری ہوں گی، یعنی اگر بکریاں ضائع شدہ کھیتی کی قیمت کے برابر پڑتی ہیں تو تم کو اس نقصان کے عوض بکریاں دی جائیں گی، اور اس طرح تمہارے نقصان کی تلافی کردی جائے گی، لیکن اس موقع پر حضرت سلیمان علیہ السلام بھی موجود تھے، چنانچہ جب انہوں نے یہ فیصلہ سنا، تو انہوں نے اس میں ترمیم کردی اور وہ فیصلہ اچھا ثابت ہوا، قرآن مجید میں فیصلہ کی اسی ترمیم کے ساتھ واقعہ ذکر کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو کیسی سمجھ دی تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا: ایسا ہونا چاہیے کہ وہ بکریاں ان کھیت والے صاحب کو دے دی جائیں، جس کی کھیتی برباد ہوئی ہے، اور یہ اس کے دودھ وغیرہ سے فائدہ اٹھائے اور جتنا نقصان ہوا ہے جب وہ ادا ہوجائے تو بکریاں واپس کردے، یعنی کلی طور پر بکریاں اس کو نہ دی جائیں، بلکہ مستعار دی جائیں، تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھائے، اور جب نقصان کی تلافی ہوجائے تو وہ واپس کردی جائیں، اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ فیصلہ پسند فرمایا، اور قرآن مجید میں اس کا ذکر فرمایا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے جس نوعیت کے ساتھ مسئلہ سلجھایا تھا، اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ آدمی یوں ہی ان کے گھر میں بلا اجازت گھس آیا اور اپنے مسئلہ کو پیش کرنے لگا، اس پر انہوں نے اس کو گھر سے نہیں نکالا یہی کم بات ہے، ان کو اس بات کا حق تھا کہ وہ کہتے کہ عدالت میں آکر اپنا مسئلہ پیش کرنا، لیکن یہ ان کے ظرف کی بات تھی کہ انہوں نے ایسا اخلاق نہیں برتا۔

حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے بادشاہ وحاکم بنایا تھا، ان کے پاس مختلف قسم کے مقدمات آتے تھے جن میں وہ فیصلہ دیتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی ذمہ داری کو پورے احساس کے ساتھ ادا کرتے تھے، ان آیات سے سمجھا جاسکتا ہے کہ نبیوں کو کن کن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے، اور کیسی کیسی صلاحیتوں کا ثبوت دینا پڑتا ہے، گویا اس میں ہر شخص کے لیے ایک پیغام ہے کہ تم نبی کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھو، اللہ تعالیٰ اس بات پر بھی قادر ہے کہ وہ

فرشتہ بھیج دیتا، اور وہ اپنی صلاحیت سے یہ سب کام کر لیتا، اس کے لیے اس میں محنت کی ضرورت نہ تھی، لیکن نبی انسان ہی ہوتا ہے، اس لیے اس کو اپنی عقل بھی استعمال کرنی پڑتی ہے، اپنی ذہانت بھی استعمال کرنی پڑتی ہے، اور لوگوں کے معاملات کو برداشت کرنا پڑتا ہے، مشکلات کو جھیلنا پڑتا ہے، ناگوار حالات پر صبر کرنا پڑتا ہے، معلوم ہوا کہ نبی کے متعلق یہ نہ سمجھا جائے کہ اس کو بہت آرام ملتا ہے، بلکہ اس کو بڑی پریشانی اور سمجھ داری سے گذرنا پڑتا ہے۔

حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے واقعہ میں یہ بات بطور خاص ذکر کی گئی کہ جب وہ دونوں اس کھیتی کے سلسلہ میں فیصلہ دے رہے تھے، جس میں دوسرے لوگوں کی بکریاں پھیل گئی تھیں، اس وقت ان کے فیصلہ کو ''ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ لوگ کیا فیصلہ دیتے ہیں''، یعنی یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی، ایسا نہیں تھا جیسا کہ آدمی کوئی واقعہ سن لیتا ہے، بلکہ یہ سب ہماری نگرانی میں ہو رہا تھا، اور ہم دیکھ رہے تھے کہ یہ لوگ اس کو کس طرح ڈیل کرتے ہیں۔

یہاں ایک بات غور کرنے کی یہ بھی ہے کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ اپنی ہی طرف نسبت کر رہا ہے کہ حضرت سلیمان نے جو فیصلہ دیا یہ ہم نے ان کو صلاحیت دی اور ان کو سمجھایا، اس کے بعد اپنی ہی طرف دونوں لوگوں کی نسبت کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے کہ داؤد ان سے سمجھداری و فیصلہ میں کم تھے، بلکہ دونوں کو ہم نے سمجھداری بھی دی اور علم بھی دیا، یعنی ان میں سے کسی کے اندر نقص نہیں ہے، بلکہ دونوں ہی بہت سمجھدار تھے، سوجھ بوجھ کے لوگ تھے اور واقف تھے، بس اپنے اپنے ذہن کے مطابق انہوں نے فیصلہ کیا، حضرت داؤدؑ نے اس کا وہ حل مناسب سمجھا جس کو اوپر بیان کیا گیا، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس سے زیادہ بہتر اللہ نے بات سجھادی، تو انہوں نے اس کا وہ حل پیش کیا، لیکن حضرت سلیمانؑ نے جو کچھ بھی کیا اس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی ہی طرف فرمائی اور صرف یہی بات نہیں بلکہ فرمایا کہ حضرت داؤد کو ہم نے اور صلاحیتیں بھی دی تھیں، یعنی صرف یہی فیصلہ کی کوئی ایک بات نہیں ہے، جس میں حضرت سلیمان آگے بڑھ گئے، بلکہ بتایا کہ حضرت داؤد کو ہم نے ایسا کر دیا کہ پہاڑ اور پرندے سب ان کے ساتھ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کائنات میں جو بھی ہے وہ اللہ کا ذکر کرتا ہے، لیکن تم اس زبان کو نہیں سمجھتے، پہاڑ، پرندے سب اللہ کو یاد کرتے ہیں، سب کی نمازوں و عبادات کی شکلیں ایسی ہیں کہ ان کو انسان نہیں سمجھ پاتا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سب اللہ کی یاد میں ہے، چنانچہ فرمایا گیا کہ ہم نے داؤد کو ایسی سمجھ دی تھی کہ پہاڑ جو ذکر کرتے ہیں، تسبیح بیان کرتے ہیں، وہ اس کو سمجھتے تھے، اور ان کے ساتھ پہاڑ و پرندے سب ہی اللہ کی تسبیح بیان کرتے تھے۔

ان سب چیزوں کے کرنے اور کسی انسان کو ایسی صلاحیتوں سے نوازنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سب کچھ ہم ہی کرتے ہیں، اور ہمارے ہی کرنے سے ہو رہا ہے، یعنی ہم ہی نے حضرت داؤد علیہ السلام میں یہ صلاحیت پیدا کر دی کہ وہ پہاڑوں کی تسبیح سمجھ رہے تھے، اور پرندوں کی تسبیح بھی سنتے تھے، جب کہ انسان نہیں سمجھتا کہ یہ پرندہ کیسے اللہ کو یاد کرتا ہے، پہاڑ کس طرح اللہ کو یاد کرتا ہے، ہمیں تو بس بتایا گیا ہے اس لیے ہم مانتے ہیں، لیکن ہمیں کوئی تجربہ نہیں ہے، البتہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت دی تھی کہ وہ سمجھتے تھے، اس کے ساتھ مزید یہ بھی ہوا کہ ان میں زرہ بنانے کی صلاحیت بھی پیدا کر دی تھی، ان کے ہاتھ میں لوہا نرم ہو جاتا تھا، اور وہ اس میں اس طرح تصرف کرتے تھے جیسے آدمی کسی نرم چیز میں کرتا ہے، چنانچہ وہ لوہے کی زرہیں بناتے تھے، جو زرہ جنگ میں حملہ روکنے کے لیے پہنی جاتی ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ ہم نے اس طریقہ سے انسانوں کو زرہ کا سلسلہ عطا کیا اور حضرت داؤد علیہ السلام کو اس کا ذریعہ بنایا کہ وہ لوہے کو آسانی سے موڑ کر زرہ بناتے تھے، اسی لیے اس چیز کو اس صیغہ کے ساتھ بیان کیا گیا کہ ہم نے تمہارے لیے ان کو لباس کی صنعت سکھا دی، تا کہ وہ زرہ تمہاری حفاظت کر سکے، تمہارے آپس میں طاقت کا جو ٹکراؤ ہوتا ہے، تم جو تلوار و نیزہ چلاتے ہو، تو اب تم اس زرہ سے میدان جنگ میں اپنے جسم کو محفوظ کر سکتے ہو۔

حضرت داؤدؑ کی خصوصیات کے ساتھ حضرت سلیمانؑ کی خصوصیات کا بھی ذکر فرمایا گیا کہ اللہ نے ان کے لیے ہوا کو تابع بنا دیا تھا کہ ہوا ان کو اور ان کے تخت کو لے کر بآسانی جہاں چاہیں پہنچا دیتی تھی، اسی طرح جنات پر بھی ان کو حکمرانی دی تھی، وہ ان کے حکم کو رد نہیں کر سکتے تھے، مگر یہ سب اللہ کے کرنے سے ہی ہوا۔

تقویٰ و پرہیزگاری

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

تقویٰ کا لفظ عام طور پر بولا بھی جاتا ہے، اور سمجھا بھی جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ کا لفظ اپنے اندر ایک سمندر لیے ہوئے ہے، جس کو کما حقہ سمجھ لینے سے آدمی متقی بن جاتا ہے، اور اللہ کے نزدیک سب سے بڑا اور معزز ہوتا ہے، اور جب اللہ کے نزدیک وہ عزت والا ہوتا ہے تو لوگوں کے دلوں میں بھی اس کی عزت بیٹھ جاتی ہے اور اس کی محبوبیت لوگوں کے دلوں میں رکھ دی جاتی ہے، کیونکہ اللہ کے نزدیک وہ عزت والا ہوتا ہے، دراصل تقویٰ کا تعلق قلب سے ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے ایک مرتبہ سینہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا:

"التقوی ھاھنا" (تقویٰ کا تعلق قلب سے ہے)

گویا یہ دل کا فعل ہے، اور دل ہی اصل ہے، کیونکہ اگر دل بن جائے تو سارا جسم بن جاتا ہے اور ایک جسم بن جائے تو کئی جسم بن جاتے ہیں اور جب کئی جسم بن جائیں تو محلّہ بن جاتا ہے، اور اگر محلّہ بن جائے تو شہر سنور جاتا ہے، اور اگر شہر سنور جائے تو ملک سنور جاتا ہے، اور اس طرح پوری دنیا میں بہار آجاتی ہے لیکن معاملہ دل ہی سے چلتا ہے، اگر انسان کا دل و دماغ ٹھیک ہوجائے تو جسم کے سارے اعضاء خود بخود ٹھیک ہوجاتے ہیں، تقویٰ کے اندر یہ واضح رہے کہ انسان کو چند اعمال کی وجہ سے اپنے آپ کو متقی سمجھنا بالکل غلط فہمی ہے، اسی طرح کسی شخص کے اعمال کو دیکھ کر اس کو متقی کا درجہ دے دینا بھی کسی درجہ میں صحیح نہیں ہے، کیونکہ کون شخص متقی ہے یا نہیں ہے یہ اللہ ہی سمجھ سکتا ہے، اس وجہ سے کسی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کو حقیر جانے، یا کسی کو حقیر کرے، دونوں باتیں ہی غلط ہیں، اسی لیے جو اللہ والے ہوتے ہیں وہ معمولی سے معمولی انسان کو بھی حقیر نہیں سمجھتے اور ان کے ساتھ بھی بہت اچھا معاملہ کرتے ہیں، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے اپنی پوری زندگی کبھی کسی انسان کے آگے پیر نہیں پھیلائے، یہاں تک کہ گھر کے افراد یا ان کے خادم بھی اگر موجود ہوتے تھے تو آپ ان کے سامنے پیر نہیں پھیلاتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ انسان ہے اور صاحب مقام بھی ہے، اس لیے میری کیا مجال کہ میں اپنے پیر پھیلاؤں، جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جو اللہ والے ہوتے ہیں ان کے سامنے ان کے گناہ اس طرح رہتے ہیں یا ان کی وہ باتیں ہوتی ہیں جن کو وہ کمزوریاں سمجھ رہے ہیں کہ وہ دوسرے کے عیوب کو دیکھنے کے روادار ہی نہیں ہوتے، اسی لیے جب کسی پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی نظر مشفقانہ وطبیبانہ یا مصلحانہ ہوتی ہے، اور بقدر ضرورت لوگوں کے مرض کو دیکھ کر علاج کرتے ہیں، لہٰذا جس طرح ڈاکٹر یہ خیال نہیں کرتا کہ میرے پاس آنے والا مریض کمتر ہے یا بہتر؟ اسی طرح ایک اللہ والا بھی کسی کو برا نہیں سمجھتا، بس یہ سوچتا ہے کہ اللہ نے مجھے اصلاح کرنے کا طریقہ دیا ہے اس لیے اصلاح کررہا ہوں، یہ نہیں کہ میں بہت بڑا ہوں، اور یہ حقیر وفقیر ہے۔

تقویٰ کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ جو انسان بھی اس کو اختیار کرتا ہے، تو اس کے اندر اللہ ایک چمک پیدا کردیتا ہے، جس کو قرآن میں "فرقانا" کہا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ مابہ الامتیاز تمہارے اندر ایک ایسی چیز پیدا کردے گا، جس سے امتیازی شان پیدا ہوجائے گی، یعنی ایسا شخص لوگوں میں ممتاز معلوم ہوگا، اس کی چال ڈھال، اس کا طرز گفتگو، اس کے معاملات کا طریقہ، غرض کہ اس کی ہر ہر ادا دوسروں سے جدا ہوگی، اسی لیے جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں ان کی بات کے انداز ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ اور ہی ہیں، اسی لیے جب آدمی متقی ہوجاتا ہے تو اس کے الفاظ بھی الگ ہوجاتے ہیں، چلنا بھی الگ ہوجاتا ہے، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کا فیصلہ فرمادیتا ہے۔

تقویٰ کا تعلق دل سے ہے، اسی لیے اصلاً تقویٰ نام ہے نیکی کا، اور نیکی نام ہے ایسے کام کا جس پر دل مطمئن ہو، اور جس کو کرنے کے بعد انسان کو اندر سے اطمینان حاصل ہوتا ہو، کیونکہ گناہ کی صفت ہی یہ ہے کہ دل میں کھٹکے اور اس کو لوگوں کے دکھانے سے وہ اٹکے، یعنی انسان کے دل میں کھٹک ہو کہ کچھ گڑبڑ ہے، اور وہ شخص اس گناہ کو لوگوں کے سامنے دکھانے سے گھبرائے، کیونکہ آدمی جب اچھا اور نیک کام کرتا ہے تو یہ چاہتا ہے کہ سب دیکھیں، اور اگر برا

کام کرتا ہے تو یہ چاہتا ہے کہ اس کو کوئی نہ دیکھے، اسی لیے تقوی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اطمینان سے کام کرتا چلا جائے، اصلاً یہ عربی کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں بچنے کے، یعنی اپنے بچاؤ اور احتیاط کی تدابیر اختیار کرنے کا نام تقوی ہے، جس کے سینکڑوں درجات ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ایسی غیر معمولی صلاحیت رکھی ہے کہ آدمی اس کے ذریعہ سے ترقی کرتا چلا جاتا ہے، گویا تقویٰ ترقی کا زینہ ہے اور بلندیوں کی لفٹ ہے، لہٰذا اگر کوئی ترقی کرنا چاہتا ہے تو تقوی کے زینہ پر چڑھنا ہوگا، اور بلندیوں کی سیڑھیوں کو طے کرنا ہوگا، اور اس کا پہلا زینہ یہ ہے کہ انسان اپنے کو شرک سے محفوظ رکھے، کیونکہ ساری منزلیں اسی پر قائم ہیں، اور اس کے بعد تمام برائیوں سے بچنے کی کوشش کرے، کیونکہ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو قرآن میں اس کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے راستہ نکال دے گا، یعنی جو بچنا چاہے گا اس کے لیے راستہ نکل آئے گا، جیسے ہندوستان جو کہ دنیا میں شرک کا سب سے بڑا مرکز ہے، یہاں شرک کی آندھیاں چل رہی ہیں، ایسے میں اگر کوئی بچنا چاہے تو اللہ اس کے لیے راستہ نکال دے گا، کیونکہ یہی وہ مرحلہ ہے جو تقویٰ کو اختیار کرنے کے لیے سب سے پہلا اور آخری و مؤثر ذریعہ ہے، نمبر دو یہ ہے کہ اگر کوئی انسان گناہوں سے بچنا چاہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے گناہوں سے بچنے کا راستہ بھی نکال دے گا، یعنی اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کا دل اندر سے اچھا ہو جائے تو وہ اللہ سے ڈرنے والا بن جائے گا، اسی طرح انسان کو شبہات سے بچنے کی بھی کوشش کرنا چاہیے، اور اگر کوئی شبہات سے بچے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا راستہ بھی آسان فرما دے گا، اسی طرح اگر کوئی حرام کمائی سے بچنا چاہے گا اور حرام آمدنی سے بچنا چاہے گا تو اللہ اس کے لیے حلال کمائی کے راستے بھی کھول دے گا، لیکن اگر کوئی نیت ہی نہ کرے تو اس کے لیے بچنا ممکن نہیں ہوگا۔

انسان کا شرک سے اور کبیرہ گناہوں سے بچنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان سے غلطی ہو جائے تو فوراً توبہ کر لے ورنہ انسان تقوی سے خارج ہو جائے گا، اسی لیے مومن توبہ کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا، لہٰذا جب انسان توبہ کرتا ہے تو وہ تقوی کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے، اس لیے توبہ کرتے رہنا چاہیے، پھر گناہ صغیرہ سے بچنا چاہیے، اور برے خیالات و جذبات سے بھی بچنا چاہیے، مباحات سے بھی بچنا چاہیے، کیونکہ یہ چیزیں ایمرجنسی ڈور Door یا ونڈو Window کی طرح ہوتی ہیں، جن کو عام طور پر نہیں کھولا جاتا، بلکہ ایمرجنسی پڑنے پر ہی کھولا جاتا ہے، ایسے ہی اسلام میں جو مباحات ہیں ان کا بھی یہی درجہ ہے، ان کو اسی وقت کھولا جاتا ہے جب اصلی دروزاہ بند ہو جائے، اور اگر اس وقت نہ کھولا جائے تو وہ اندر ہی مر جائے گا، لہٰذا ''مباح'' عمل کے لیے نہیں، ایمرجنسی کے لیے ہے، جیسا کہ طلاق کا معاملہ ہے جو کہ بالکل آخری مرحلہ میں استعمال کی اجازت دی جانے والی چیز ہے، الغرض تقوی یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو خرافات سے بچاتا رہے۔

بقیہ: سیرت محمدی ﷺ کا پیغام

.....﴿وَأَنفِقُواْ فِي سَبِيلِ اللّهِ وَلاَ تُلْقُواْ بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُواْ إِنَّ اللّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (اللہ کے راستہ پر خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو اور اچھی طرح کام کرو، بے شک اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)

مسلمان کی زندگی کی اصلی ساخت یہی ہے کہ یا تو اسلام کی دعوت اور عملی جدوجہد میں مشغول ہو یا اس دعوت و عملی جدوجہد میں مشغول ہونے والوں کے لیے پشت پناہ و مددگار ہو، اس کے ساتھ بھی عملی جدوجہد میں حصہ لینے کا عزم اور شوق رکھتا ہو، مطمئن شہری اور محض کاروباری زندگی اسلامی زندگی نہیں ہے، اور کسی طرح بھی یہ ایک مسلمان کا مقصود حیات نہیں ہو سکتا، جائز مشاغل زندگی، جائز وسائل معیشت ہرگز ممنوع نہیں، بلکہ نیت اور اجر طلبی کے ساتھ عبادت و قرب الٰہی کا ذریعہ ہیں، مگر اس وقت جب یہ سب دین کے سایہ میں ہوں اور صحیح مقاصد کا وسیلہ ہوں نہ کہ خود مقصود بالذات ہوں۔

سیرت محمدی ﷺ کا یہ سب سے بڑا پیغام ہے جو خالص مسلمانوں کے نام ہے، اس کی طرف توجہ نہ کرنا اس کے مقصد کو ضائع کرنا، اور سب سے بڑی حقیقت کی طرف سے چشم پوشی ہے جو سیرت محمدی ﷺ مسلمانوں کے سامنے پیش کرتی ہے۔

گذشتہ سے پیوستہ

توحید کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مؤثر طریقہ دعوت:- دعوت کی راہ کا کھلا دروازہ یہ ہے کہ آدمی کہیں پر بھی بات کرنے جائے تو سب سے پہلے یہ کوشش کرے کہ ان لوگوں کے مزاج کو سمجھے، وہ کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں؟ ان کے کیا طریقے ہیں؟ ان کی کیا خصوصیات ہیں؟ اس کو سمجھ لے، اس کے بعد جب آدمی جا کر بات کرے تو ان باتوں کا دھیان رکھے، اور جو چیزیں ان کی ذرا بھی بھلائی اور خیر کی ہوں، پہلے ان چیزوں کا تذکرہ کرے تاکہ وہ لوگ مانوس ہو جائیں، وہ یہ سمجھیں کہ یہ ہماری خوبیوں سے واقف ہیں، ایسا نہیں ہے کہ یہ ہم کو نہیں جانتے، پھر دوسری بات یہ کہ مخاطبین سے تعلق کا اظہار کیا جائے، اگر ذرا بھی کوئی تعلق داعی کا مخاطبین سے ہو تو اس رشتہ کو ضرور بیان کرے کہ آپ سے تو ہمارا بڑا گہرا تعلق ہے، آپ تو ہمارے وطن کے ہیں، ہمارے علاقہ کے رہنے والے ہیں، ہماری قوم کے ہیں، غرض جو بھی رشتہ ہو سکے اس کا اظہار کرے، کیونکہ اس سے اپنائیت پیدا ہو جاتی ہے، اور اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے، پھر دعوت کا کام بڑا آسان ہو جاتا ہے، اگر دروازہ نہیں کھلا تو بڑی دشواریاں آئیں گی، آپ زبردستی کریں گے تو اس کا یہ نقصان ہے کہ آپ جو آگے خیر کی بات کہنے والے ہیں آدمی اس کو قبول نہیں کرے گا اور اجنبی سمجھے گا، اور ایسی صورت میں بات مؤثر نہیں ہوگی، تو جو دعوت کا کام کرنے والا ہو وہ کہیں بھی کام کرے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ان پہلوؤں کو مدنظر رکھے، اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت طیبہ میں ایک دو نہیں ہزاروں مثالیں اس طرح کی موجود ہیں کہ آپ ﷺ نے کس طرح دعوت دی، آپ ﷺ نے لوگوں کو کس طرح سمجھایا، یہ مثالیں ہمارے سامنے ہیں، اور مذکورہ حدیث میں بھی ہمیں بڑی حکمت کی باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ ترتیب و تدریج اختیار کی جائے اور بہتر طریقہ بھی اختیار کیا جائے، یہی قرآن مجید کی بھی تعلیم ہے۔

دعوت توحید کی حکمت:- مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا کہ سب سے پہلے اہل کتاب کو توحید کی دعوت دینا، دعوتِ توحید پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ایک تو جو ترتیب ہے، اس کے لحاظ سے فرما رہے ہیں، اس لیے کہ سب سے پہلی اور بنیادی چیز یہی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ یہ ایک مشترک پوائنٹ ہے جس پر جمع ہونے کی دعوت دی جا رہی ہے، سابقہ سطور میں اس سلسلہ کی قرآنی آیت گذر چکی ہے جس میں اہل کتاب کو کلمہ سواء پر آنے کی دعوت دی گئی ہے، ارشاد ہے: ﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ... مُسْلِمُونَ﴾ (آل عمران: ٦٤)

(آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے (وہ یہ) کہ ہم صرف اللہ کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کچھ بھی شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنالے پھر اگر وہ نہ مانیں تو تم کہہ دو کہ تم لوگ گواہ رہنا کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں)

اگر اس آیت کو آپ سامنے رکھیں تو اور زیادہ حقیقت کھل جائے گی کہ آپ ﷺ ان کو سب سے پہلے مرحلہ پر ہی توحید کی دعوت دینے کی جو بات فرما رہے ہیں وہ اس لیے کہ وہ اس بات کے کسی نہ کسی درجہ میں قائل تھے، یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس بات کا ان کو دعوی تھا کہ ہم توحید کے ماننے والے ہیں، ہم ایک اللہ کے ماننے والے ہیں، جب اس بات کا ان کو دعوی ہے، تو گویا یہ وجہ مناسبت ہے، یہ وہ اشتراک ہے کہ جب آپ اس کا تذکرہ کریں گے تو ان کے اندر ایک تجسس و خیال پیدا ہوگا، اور یہ چیز ان کے ذہن میں آئے گی کہ یہ لوگ بھی کوئی الگ نہیں ہیں، یہ وہی بات کہہ رہے ہیں جس کے ہم قائل ہیں، البتہ وہ کس حد تک مانتے ہیں؟ اس کی تفصیلات کیا ہیں؟ وہ ایک الگ مسئلہ ہے، لیکن جب ان کے سامنے توحید کا نام آئے گا تو یہ ان کو مانوس کرنے کا ایک موضوع بن جائے گا، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے توحید کی دعوت دو، گویا یہاں تدریجی اور ترتیبی مرحلہ یہی تھا اور حکمت بھی اسی میں تھی کہ وہ لوگ (اہل کتاب) توحید کے ماننے والے تھے، تو ان سے

توحید کی بات اولاً کہی جائے، جب آپ توحید کی بات کہیں گے تو وہ اس بات کو تسلیم کریں گے۔

مخاطبین کی رعایت:- اگر آپ ایسے لوگوں کو دعوت دینے جارہے ہیں، جیسے ہمارے یہاں برادران وطن ہیں، آپ پہلے مرحلہ ہی میں جایئے اور ان سے کہیے کہ صرف اللہ کو مانو، سب بتوں کو توڑ دو، یہ شرک تمہیں جہنم تک پہنچادے گا، تو ہوسکتا ہے کہ ردعمل پیدا ہو اور پہلے ہی مرحلہ پر وہ وہ بات سننے سے انکار کردیں، بلکہ یہاں ہوسکتا ہے آپ کو اور لمبی ترتیب اختیار کرنی پڑ جائے، جو توحید سے کوسوں دور ہیں اور شرک میں ڈوبے ہوئے ہیں، یہاں پہلے مرحلہ میں اگر آپ توحید کی دعوت دے دیں گے تو ہوسکتا ہے کہ وہ بدک جائیں، لہٰذا آپ یہاں پہلے انسانیت کی بات کہیں، وہ مشترک قدریں جو ان میں اور آپ میں ہیں ان کا تذکرہ کریں، جب ان کا تذکرہ ہوگا تو ان کے دل ودماغ کھلیں گے، گویا یہاں یہ کھلا دروازہ ہے، جب دروازہ کھل جائے گا تو آپ اندر جائیں گے، پھر آپ ان کو بتایئے کہ توحید و رسالت کیا ہے، اور تفصیلات کیا ہیں، لیکن آپ جو پہلا مرحلہ اختیار کریں گے اس میں اس ترتیب کا لحاظ رکھنا پڑے گا کہ جو بات ان کے لیے مانوس ہو، پہلے مرحلہ میں وہ بات کی جائے۔

تدریجی مرحلہ میں یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ بات کہی جائے جس سے مخاطبین مانوس ہوں، پھر جو اہم بات ہے وہ پہلے کہی جائے، ظاہر ہے توحید سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں، لیکن یہاں اس کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ اگر پہلے مرحلہ میں توحید کی بات کرنے سے مخاطبین بدکتے ہوں تو ان کے لیے بہتر یہی ہے کہ ترتیب میں وہ چیز اختیار کی جائے جو ان کے لیے مانوس کن ہو، جب وہ چیز اختیار کرلیں گے تو جو اہم چیز ہے، ان کے لیے اس کا قبول کرنا آسان ہوگا، اور اگر آپ سوچیں گے کہ سب سے اہم یہی ہے، اس کو ہم پہلے بیان کردیں، تو ہوسکتا ہے کہ یہ چیز ان کے لیے سد راہ بن جائے، اور آگے آپ کو بات کرنا مشکل ہو۔

حکمت کی اہمیت:- مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ نے بہت حکیمانہ باتیں ارشاد فرمادیں، فرمایا کہ توحید کی دعوت دینا، پھر جب وہ اس بات کو بہت اچھی طرح سمجھ لیں اور بہت اچھی طرح جان لیں، تب ان سے بتانا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر پانچ وقت کی نمازیں بھی فرض کی ہیں، معلوم ہوا توحید کا قائل ہونے کے بعد فوراً تمام احکامات نہیں سنانا ہے، اگر کسی نے کلمہ پڑھ لیا پھر اس سے پہلے ہی دن یہ کہا جائے کہ دیکھو ایک مہینہ کے روزہ فرض ہیں، پانچ وقت کی نماز فرض ہے، صاحب نصاب پر سال میں زکاۃ فرض ہے، صاحب حیثیت پر عمر میں حج فرض ہے، تو وہ سوچے گا کہ کیا کیا فرض ہے، ہم کیا کیا کریں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دین کو بوجھل سمجھ کر اس سے بددل ہوجائے گا، معلوم ہوا اس طرح کے انداز دعوت سے ترتیب بگڑ جاتی ہے، مناسب یہ ہے کہ آپ اس کو حکمت سے بات سمجھائیں، پہلے مرحلہ میں ساری باتیں نہ کہیں، بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ جب کلمہ پڑھ لیا تو نام بدلنا فوراً ضروری ہے، جب نام ہی نہیں بدلا تو یہ کیسے مسلمان ہوا، حالانکہ یہ بات ترتیب کے خلاف ہے، اور دعوت کے کام میں بہرحال ترتیب کو ملحوظ رکھنا ہوگا جیسا کہ حضور ﷺ نے اس حدیث میں وضاحت فرمائی ہے، ترتیب سے آدمی کسی کو بات سمجھتا ہے تو بات اس کے دل میں اترتی ہے، وہ بات کو اخذ کرتا ہے، اگر ایک دم سے سب چیز لاد دیجیے تو جو کھلا راستہ ہے وہ بھی بند ہوجائے گا، کوئی چیز بھی اندر نہ جائے گی، لیکن اگر تھوڑی تھوڑی چیز ڈالی جائے تو اگر چھوٹا سوراخ بھی ہے تب بھی کام ہوجائے گا۔

مطلوب کیا ہے؟ مذکورہ حدیث میں دعوت توحید کے بعد آپ ﷺ نے نماز کا جو ذکر فرمایا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نماز سکھا کر فارغ ہوگئے، بلکہ اس کے بعد اور بھی چیزیں ہیں، نماز کے بعد روزہ بتایا جائے، پھر زکاۃ اور حج کو بتایا جائے، پھر اور معاملات سکھائے جائیں، کیونکہ دین پوری زندگی کا نام ہے، لہٰذا زندگی کا جو بھی طریقہ ہے وہ طریقہ بتایا جائے گا، حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ دو چیزیں بتادینا کافی ہے، بلکہ یہ مثال کے طور پر دو باتیں فرمائی گئیں، اور ترتیب وحکمت سکھانے کے لیے ان دو چیزوں کا ذکر ہے، ورنہ مراد یہ ہے کہ اسی ترتیب کے ساتھ حکمت و تدریج کا خیال کرتے ہوئے ایک ایک چیز بتائی جائے، تاکہ لوگ اس سے مانوس ہوجائیں اور مکمل دین ان کے اندر پیدا ہوجائے۔

مدینہ کے منافقین

عبدالسبحان ناخدا ندوی

عہد نبوی ﷺ میں مدینہ منورہ میں منافقین کا ایک طبقہ پایا جاتا تھا، یہ لوگ زبان سے ایمان کا دعوی کرتے تھے، لیکن ان کے دل ایمان سے خالی تھے، نہ ان میں ایسی اخلاقی جرأت تھی کہ کھلم کھلا اپنے کافر ہونے کا اقرار کریں، اور نہ دل میں ایسی پاکیزگی تھی کہ دل وجان سے ایمان کے صاف ستھرے عقیدے کو تسلیم کرلیں، مکاری ان پر ختم تھی اور یہی مکاری ان کی زندگی کا اصل سہارا تھی، قرآن کریم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت کو ان سے جتنی نفرت ہے شاید کسی اور سے نہ ہو، اسی لیے جہنم کے بھی پست ترین طبقہ میں ان کو جھونک دیا جائے گا، ارشاد الٰہی ہے: ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَن تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا﴾ (منافقین بلاشبہ آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے، ان کے لیے تم ہرگز کسی مددگار کو نہیں پاؤ گے)

نفاق دو طرح کا ہوتا ہے؛ اعتقادی نفاق اور عملی نفاق، اعتقادی نفاق کا مطلب یہ ہے کہ دل میں کفر ہو اور زبان پر ایمان کا اظہار، رسول ﷺ کے زمانہ میں اس طرح کے منافقین بہت تھے، ان کی ایک بڑی تعداد وحی کے ذریعہ آپ ﷺ کو بتلادی گئی تھی، مشہور صحابی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ نے کئی منافقین کے نام تک بتائے تھے، یہ سب منافق اسلام سے خارج تھے۔

عملی نفاق کا مطلب یہ ہے کہ دل میں تو ایمان کمزور ہی سہی موجود ہو، لیکن عملی زندگی کو ایمان سے واسطہ ہی نہ ہو، جھوٹ، خیانت، وعدہ خلافی، فسق وفجور، مکاری اور ہر طرح کی خرابیوں سے زندگی بھری ہو، چونکہ اعتقادی منافق ایسے ہی ہوا کرتے تھے، اس لیے اپنے طرز عمل میں ایسے منافقوں سے مشابہت رکھنے والوں کو عملی منافق کہا جاتا ہے، عملی نفاق بھی بدترین قسم کی گمراہی ہے، بلکہ عملی نفاق اعتقادی نفاق کی خندق میں گرانے والی ایک کیفیت ہے، البتہ ایسے شخص کو اسلام سے خارج نہیں کہا جائے گا، آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں اعتقادی اور عملی نفاق سے آلودہ یہ بدبودار ٹولہ موجود تھا، جو شب وروز مسلمانوں میں گھس کر ان کی صفوں میں انتشار برپا کرنے کی کوشش کرتا تھا، ان تمام منافقین کو یہودیوں کی شہ حاصل تھی، یہ عین ممکن تھا کہ اللہ کی طرف سے ایک ایک منافق کی نشاندہی کرکے ان کی گردن اڑا دینے کا حکم دیا جاتا، اور ان کا قصہ ہی ختم ہوجاتا، لیکن اللہ کی طرف سے ایسا حکم نہیں آیا، اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں: ایک یہ کہ تمام منافقین معاشرتی طور پر مسلمانوں ہی کا حصہ سمجھے جاتے تھے، مشرکین کی نگاہ میں ان کا قتل خود مسلمانوں ہی کا آپسی قتل سمجھا جاتا، عام فضا اس سے متاثر ہوتی، یہود مدینہ اور مشرکین دونوں کو مزید فتنہ انگیزی کے مواقع ہاتھ آجاتے، خود آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ یہ بات ارشاد فرمائی کہ اگر میں ان کو قتل کردوں تو لوگ کہیں گے کہ محمد ﷺ تو اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں، گویا یہ عمل اسلام کی نشر واشاعت میں ایک رکاوٹ بنتا، اس وقت ضرورت تھی کہ لوگ اسلام میں داخل ہوکر مسلمانوں کو مضبوطی فراہم کریں، اسی طرح بعض سادہ لوح مسلمان دشمنان دین کی فتنہ انگیزیوں سے متاثر بھی ہوسکتے تھے، چونکہ منافقین خاندانی طور پر انصارِ مدینہ کے رشتہ دار تھے، اس لیے اس کا امکان تھا کہ دشمنوں کی طرف سے منافقین کے قتل کو غلط رنگ دے کر خاندانی وقبائلی عصبیت کو ہوا دی جاتی، اور نتیجہ کے طور پر صحیح ایمان والوں کے قدم بھی ڈگمگا جاتے، اسی لیے آپ ﷺ کی طرف سے ان منافقین کے ساتھ نرمی و رواداری کا معاملہ رہا، بعد میں اللہ کی طرف سے حکم آیا کہ منافقین کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا جائے تو آپ ﷺ اور تمام اہل ایمان کا معاملہ منافقین کے ساتھ سختی کا ہونے لگا، دوسری طرف اسلام کی ترقی کے ساتھ ساتھ منافقین کی کاروائیاں بھی دم توڑنے لگیں، غزوۂ تبوک تک منافقین کی اچھل کود جاری رہی، زمانہ نبوت کے بالکل آخری دور میں یہ منافق اپنی موت آپ مرگئے، کچھ ایمان والے بنے اور باقی جو بچے ان کی ہمتیں جواب دے گئیں اور تمام منافقین اندر ہی اندر گھٹ کے رہ گئے، بہرحال نفاق کی بنیاد پر آنحضرت ﷺ نے کسی کو قتل نہیں فرمایا، ہاں قصاص میں یا قتل کی کسی اور وجہ سے کوئی منافق مارا گیا ہو تو دوسری بات ہے۔

منافقین کے قتل کا حکم نہ آنے کی دوسری وجہ شاید یہ رہی ہو کہ خود

مسلمانوں کو اندرونی فتنوں اور سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کیا جائے تاکہ اسلام کی یہ اولین مبارک جماعت ہر طرح کے فتنوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھرپور تیار رہے، اس لیے بالقصد منافقین کو رہنے دیا گیا تاکہ ان کے نت نئے حربوں اور طرح طرح کی چالوں کو اچھی طرح سمجھا جائے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے معاً بعد جب مانعین زکاۃ کا فتنہ اٹھا تو اس فتنہ کا شکار ہونے والوں میں کوئی صحابی رسول نہ تھا، اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا جو دردانگیز واقعہ پیش آیا اور سارا عالم اسلام ایک طرح سے فتنوں کی زد میں آگیا، تب بھی کوئی صحابی رسول اس فتنہ انگیز کاروائی میں نہ عملاً شریک رہا اور نہ کسی کی پشت پناہی کی، کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ جنگ جمل اور جنگ صفین میں تو صحابہ کرام ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا تھے، پھر کیسے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی فتنہ کا شکار نہ ہوئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جنگ جمل اور جنگ صفین میں صحابہ کرام کی تعداد کم تھی، شورش پسند بہت زیادہ تھے، معاملہ سلجھانے کی کوششیں کی گئیں، لیکن فتنہ پرور شورش پسند کسی کے قابو میں نہ تھے، اس لیے معاملہ الجھتا گیا، بدگمانی اور بے اعتمادی کی فضا بنائی گئی، اور وہ واقعات پیش آئے جو صحابہ کرام میں سے کوئی نہ چاہتا تھا کہ پیش آئیں، حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے کتنی مبارک بات فرمائی کہ یہ جنگیں فتنہ ضرور تھیں لیکن اس میں شامل کوئی صحابی مفتون (فتنہ میں ملوث) نہیں تھا۔ واللہ اعلم.

منافقین مدینہ کے دلوں کی حالت کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ ہر اچھا کام ان کو غلط دکھائی دیتا، اور فتنہ وفساد کے کام ان کو بڑے بھلے معلوم ہوتے، قرآن کریم نے متعدد مقامات پر ان کے دلوں کے روگ بیان کیے ہیں جن میں سے مشہور امراض یہ ہیں؛

(۱) سب سے بڑا مرض خود نفاق تھا، اسی جڑ سے کئی اور امراض پیدا ہوئے، جیسے؛

(۲) شکوک وشبہات، کسی بھی اچھی بات کو سیدھے انداز میں لیتے ہی نہ تھے، شکوک وشبہات کے ذریعہ معاشرے میں بداعتمادی کی فضا پیدا کرتے تھے، افواہیں پھیلانا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا، الزام تراشی اور بہتان طرازی ان کی عادت تھی، قرآن کریم نے اس کا سخت نوٹس لیا اور یہ اعلان کیا کہ اگر منافقین نے اپنی روش نہ بدلی تو ان کا قتل عام کیا جائے گا، ﴿لَئِن لَّمْ يَنتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ☆ مَّلْعُونِينَ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا﴾ (اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے اور مدینہ میں شرانگیزی کرنے والے باز نہ آئے تو ہم آپ کو ان کے پیچھے لگادیں گے پھر وہاں وہ کچھ ہی مدت آپ کے ساتھ رہ پائیں گے، وہ پھٹکارے ہوئے لوگ، جہاں کہیں ملیں گے پکڑے جائیں گے اور اچھی طرح مارے جائیں گے)

(۳) مکاری ان کی رگ رگ میں رچی ہوئی تھی، اپنی تمام تر غلاظتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے جھوٹ اور مکر وفریب کو بہت بڑے سہارے کے طور پر استعمال کرتے تھے، قرآن کہتا ہے؛ ﴿اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (انھوں نے اپنی قسموں کو ایک ڈھال بنا رکھا ہے پھر وہ اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں، یقیناً جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ بدترین کام ہیں)

(۴) جان کی حد سے بڑھی ہوئی محبت نے عزت وغیرت کا جنازہ نکال دیا تھا، بزدلی اور نکمے پن نے کھوکھلے دعووں میں پناہ دے رکھی تھی، میدان عمل میں زیرو تھے، ارشاد ہے؛ ﴿وَلَا يَأْتُونَ الْبَأْسَ إِلَّا قَلِيلًا ☆ أَشِحَّةً عَلَيْكُمْ فَإِذَا جَاءَ الْخَوْفُ رَأَيْتَهُمْ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ كَالَّذِي يُغْشَىٰ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَإِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوكُم بِأَلْسِنَةٍ حِدَادٍ أَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ أُولَٰئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوا فَأَحْبَطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ﴾ (اور خود بہت ہی کم جنگ میں شریک ہوتے ہیں، حال یہ ہے کہ وہ تم پر بڑے حریص ہیں، پھر جب ڈر کا وقت آتا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ ڈگر ڈگر کرتی آنکھوں سے آپ کو تکتے ہیں جیسے کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہونے لگے، پھر جب ڈر ختم ہوجاتا ہے تو وہ مال کی لالچ میں آپ سے مل کر بڑی تیز تیز زبانیں چلاتے ہیں یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائے بس اللہ نے ان کے سب کام اکارت کردیئے)

(۵) پیسوں کی بے تحاشا محبت نے کنجوسی اور بے رحمی پیدا کی تھی، ایک نامعلوم خوف ان پر ہمیشہ مسلط رہتا تھا زندگی کی صاف روشن شاہراہ پر چلنا ان کو نصیب نہ ہوسکا..... (باقی صفحہ/۱۶ پر)

گذشتہ سے پیوستہ

مسافر کی نماز

مفتی راشد حسین ندوی

وطن کی قسمیں:- وطن کی فقہاء نے دو قسمیں بیان کی ہیں؛ (۱) وطن اصلی (۲) وطن اقامت۔

وطن اصلی اس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں انسان کی پیدائش ہوئی ہو، یا جہاں انسان نے شادی کی ہو اور بیوی کو وہیں رکھے ہوئے ہو یا جس جگہ کو اس نے اپنا وطن بنالیا ہو اور تاعمر وہیں قیام کا ارادہ ہو۔

(ہندیہ: ۱/۱۴۲، شامی: ۱/۵۸۶)

اگر کوئی شخص آبائی وطن میں نہیں رہتا، صرف سال میں ایک دو بار ہی وہاں آنے کا اتفاق ہوتا ہے، لیکن اس نے یہ نیت نہیں کی ہے کہ اب وہ اس کا وطن نہیں رہا تو اب بھی وہ اس کا وطن اصلی رہے گا، اور وہاں پہنچتے ہی مکمل نماز پڑھنا شروع کردے گا، اگرچہ پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہ ہو۔

اسی طرح اگر کسی شہر میں شادی کی اور بیوی کو اسی میں رکھا، خود وہاں مستقل قیام کا ارادہ نہیں ہے تو اس جگہ بھی پہنچتے ہی مقیم مانا جائے گا، خواہ پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہ ہو۔

اگر ایک آبائی وطن ہو اور ایک بستی کو اس نے مستقل قیام کے لیے وطن بنالیا جہاں وہ بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہو تو اگر آبائی وطن کو ہمیشہ کے لیے خیرباد نہ کہا ہو تو یہ دونوں جگہیں اس کے لیے وطن اصلی ہوں گی، اور دونوں بستیوں میں سے جہاں بھی پہنچے گا، مقیم مانا جائے گا، اس لیے کہ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ وطن اصلی دو یا اس سے زیادہ بھی ہوسکتے ہیں۔

(ہندیہ: ۱/۱۴۲، شامی: ۱/۵۸۶، البحر الرائق: ۲/۱۳۹)

جائے ملازمت کا حکم: آج کل کثرت سے یہ بات پیش آتی ہے کہ انسان کا آبائی وطن کہیں الگ ہوتا ہے، پھر وہ کسی جگہ ملازم ہوجانے کے سبب وہیں رہنا شروع کردیتا ہے، آبائی وطن میں صرف طویل چھٹیاں گزارنے آتا ہے، تو کیا اس طرح کی جائے ملازمت کو وطن اصلی مانا جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر وہاں بیوی بچوں کے ساتھ مقیم ہے اور ذاتی مکان بھی بنالیا ہے، ارادہ وہیں مستقل رہنے کا ہے، تو یہ مکمل طور سے وطن اصلی کے حکم میں ہوجائے گا، اور اگر ذاتی مکان نہیں بنایا، لیکن بیوی بچوں کے ساتھ کرایہ کے مکان یا کمپنی وادارہ کے فراہم کردہ مکان میں اہل وعیال کے ساتھ مستقل قیام کے ساتھ رہ رہا ہے، تو باعتبار حکم کے یہ جگہ بھی وطن اصلی کے حکم میں ہوگی اور وہاں پہنچتے ہی اتمام شروع کردے گا، خواہ پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کی نیت ہو۔

(البحر الرائق: ۲/۱۳۹، نئے مسائل اور فقہی اکیڈمی کے فیصلے: ۹۱، کتاب المسائل: ۱/۵۱۸)

وطن اقامت: اگر مسافر کسی شہر یا بستی میں جو اقامت کے لائق ہے پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت کرے تو اس کو وطن اقامت کہا جاتا ہے، لیکن اقامت کی نیت اسی وقت معتبر ہوتی ہے جب پانچ شرائط پائی جائیں؛

۱- یہ نیت سفر موقوف کرکے کی ہو، ورنہ اگر سواری پر چلتے چلتے نیت کی تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

۲- جس جگہ ٹھہرنے کی نیت کی ہو وہاں قیام کرنا ممکن بھی ہو، چنانچہ اگر کسی جنگل، ویرانے یا سمندر وغیرہ میں قیام کی نیت کی تو اقامت معتبر نہیں ہوگی، اور اس نیت کے باوجود اسے مسافر سمجھا جائے گا۔

۳- ایک بستی میں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت ہو، اگر دو بستیوں میں ملاکر پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت کی، لیکن کسی ایک جگہ بھی پندرہ دن کا قیام نہیں ہوتا ہے تو وہ مسافر ہی شمار ہوگا۔

۴- پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت ہو (اس سے کم ٹھہرنے کی نیت ہو تو مقیم نہیں ہوگا جیسا کہ گزر چکا ہے)

۵-نیت کرنے والا اپنی رائے اور ارادہ میں آزاد ہو، چنانچہ اگر کسی دوسرے شخص کا تابع ہے تو اس کی نیت کا اعتبار نہیں ہے، جیسے؛ بیوی، نوکر وغیرہ، اس حالت میں متبوع یعنی شوہر اور مالک وغیرہ کی نیت کا اعتبار ہوگا، جو جماعتیں دوسرے شہروں میں جاتی ہیں، وہ بھی قیام کرنے اور سفر کرنے میں دوسرے حضرات کی تابع ہوتی ہیں، تو اگر انہیں بھی مکمل طور سے ذمہ داروں کی بات ماننے کا عزم ہے تو ان کی بھی نیت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ (ہندیہ:۱/۱۳۹)

وطن اصلی کب باطل ہوتا ہے: اگر کوئی شخص اپنے وطن اصلی سے کوچ کر جائے، وہاں مستقل رہنے کا ارادہ ختم کردے، بیوی بچوں کو بھی وہاں سے ہٹالے، تو اب یہ جگہ اس کی وطن اصلی باقی نہیں رہے گی، اور اگر وہاں اہل وعیال کو چھوڑ رکھا ہے تو اوپر گزر چکا کہ اب بھی وہ جگہ وطن اصلی رہے گی، یاد رہے کہ وطن اصلی کے احکام صرف سفر کرنے یا کسی جگہ کو وطن اقامت بنالینے سے ختم نہیں ہوتے۔ (ہندیہ:۱۴۲۱، شامی:۱/۵۸۶)

وطن اقامت کب باطل ہوتا ہے: جہاں تک وطن اقامت کا تعلق ہے تو وہ صرف سفر کرنے سے بھی باطل ہوجاتا ہے، چنانچہ اگر کسی جگہ پندرہ دن یا اس سے زیادہ دنوں تک ٹھہرنے کی نیت کی پھر وہاں سے مسافر سفر پر چلا گیا، اب جب سفر کرے گا تو وطن اقامت تبھی رہے گا جب دوبارہ مزید پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت ہو، اگر سفر سے واپسی میں پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کی نیت ہو تو اب یہ وطن اقامت نہیں رہے گا اور اسے وہاں قصر کرنا ہوگا، اسی طرح وطن اقامت وطن اصلی چلے جانے سے بھی باطل ہوجاتا ہے، الا یہ کہ لوٹ کر پھر پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کی ہو اور دوسری جگہ کو وطن اقامت بنالینے سے بھی باطل ہوجاتا ہے۔
(ہندیہ:۱/۱۴۲، شامی:۱/۵۸۶)

دوران سفر وطن اصلی سے گزرنا: اگر دوران سفر کوئی شخص اپنے وطن اصلی سے گزرے تو شہر میں داخل ہوتے ہی وہ مقیم ہوجائے گا، خواہ وہاں سے صرف گزرنا ہو یا کسی کام سے داخل ہو، پھر اب منزل وطن اصلی سے سفر کی مسافت پر ہو تو وہاں سے نکلتے ہی دوبارہ مسافر ہوجائے گا، اور اگر وطن اصلی سے وہ جگہ مسافت سفر سے کم پر ہو تو اب وہاں پہنچنے تک مقیم رہے گا۔
(ہندیہ:۱/۱۴۲)

دوران سفر وطن اقامت سے گزرنا: اگر وطن اقامت سے مسافت سفر کے لیے نکلا، لیکن کسی وجہ سے پھر وطن اقامت سے گزرنا پڑا تو وطن اقامت میں وہ مسافر ہی رہے گا، اس لیے کہ وطن اقامت سفر کرلینے سے باطل ہوجاتا ہے، البتہ اگر وطن اقامت سے کسی ضرورت سے آس پاس کی کسی بستی میں گیا، پھر اس بستی سے اس کا ارادہ سفر کا بن گیا لیکن درمیان میں وطن اقامت پڑے گا اور منزل وطن اقامت سے مسافت قصر پر نہیں ہے، ہاں اس بستی سے مسافت قصر پر ہے جہاں فی الحال وہ مقیم ہے تو یہ شخص مسافر نہیں بنے گا، اس لیے کہ وطن اقامت سفر سے باطل ہوتا ہے، اور وطن اقامت سے سفر نہیں پایا گیا، لیکن اگر مذکورہ بستی سے ایسا راستہ اختیار کیا جس میں وطن اقامت نہیں پڑتا تو وہ مسافر بن جائے گا، اسی طرح اگر وطن اقامت سے منزل مسافت قصر پر ہو تب بھی وہ مسافر بن جائے گا۔ (شامی:۱/۵۸۶)

نابالغ اور حائضہ کے لیے ایک ضروری مسئلہ

مسئلہ: اگر دوران سفر کوئی نابالغ بالغ ہوگیا، یا کوئی حائضہ پاک ہوگئی تو جس جگہ یہ پیش آیا ہے وہاں سے اگر منزل مقصود مسافت سفر پر ہے تو وہ مسافر ہوں گے، لیکن اگر مطلوبہ منزل مسافت سفر سے کم پر رہ گئی تھی تو دونوں مقیم رہیں گے اور نماز کا اتمام کریں گے، اس لیے کہ مدت سفر کا اعتبار عورت کے پاک ہونے اور بچہ کے بالغ ہونے کی جگہ سے کیا جائے گا، اس کے برخلاف اگر کوئی کافر مسافت سفر کے لیے نکلا اور پھر راستہ میں مسلمان ہوگیا تو وہ مسافر ہوگا، خواہ مسلمان ہونے کی جگہ سے منزل مسافت سفر پر ہو یا اس سے کم ہو۔ (شامی:۱/۵۸۸)

مسافر کا بھولے سے چار رکعات پڑھ لینا: اگر سفر کی حالت میں بھولے سے چار رکعات پڑھ لیں تو اگر دو رکعت کے بعد قعدہ کرلیا تھا تو اس کی نماز کراہت کے ساتھ ہوجائے گی، اس کو سجدۂ سہو کرلینا چاہیے، اور اخیر کی دو رکعتیں نفل بن جائیں گی، اور اگر دو رکعت کے بعد قعدہ نہیں کیا تو اس کی نماز

باطل ہوجائے گی، اس لیے کہ مسافر پر دو رکعت کے بعد قعدہ فرض تھا، فرض چھوڑنے والے کی نماز درست نہیں ہوسکتی۔

(ہندیہ:۱/۱۳۹، احسن الفتاوی:۴/۷۷)

ٹرین پر نماز کا حکم: فقہاء نے صراحت کی ہے کہ گھوڑے، اونٹ اور دوسرے جانوروں پر صرف نفل نمازیں پڑھ سکتا ہے، اس صورت میں نماز اشارہ سے پڑھے گا، اور رخ کرنے کی بھی فرضیت ساقط ہوجائے گی، لیکن فرائض کے لیے ان جانوروں سے اترنا پڑے گا، اور باقاعدہ استقبال قبلہ کے ساتھ رکوع سجود کرتے ہوئے نماز پڑھے گا، اگر سیدھے جانور پر نہیں بیٹھا ہے، بلکہ بیل گاڑی یا تانگہ جیسی کسی گاڑی پر بیٹھا ہے جس کا ایک سرا جانور کے اوپر رکھا ہوا ہے تو وہ بھی جانور ہی کے حکم میں ہے، یعنی نوافل جائز ہیں فرائض جائز نہیں ہیں، اور اگر گاڑی کا کوئی حصہ جانور پر نہیں رکھا ہوا ہے، جانور صرف اس کو کھینچنے کا کام کررہا ہے، تو اس کا حکم تخت جیسا ہے، اس پر فرائض اور نوافل سب جائز ہیں۔ (ہندیہ:۱/۱۴۳)

ٹرین کو بھی اسی پر قیاس کیا گیا ہے، اور فرائض ونوافل سب کو اس میں پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے، لیکن جہاں تک ہو کھڑے ہوکر اور استقبال قبلہ کرکے نماز پڑھنی چاہیے، اگر استقبال قبلہ یا رکوع سجود ازدحام وغیرہ کی وجہ سے ممکن نہ ہو تو فی الحال جس طرح ممکن ہو نماز پڑھ لے، لیکن بعد میں سواری سے اترنے کے بعد اس نماز کا اعادہ کرنا ضروری ہوگا، یہی حکم بس اور ہوائی جہاز پر بھی نماز کا ہے۔ (احسن الفتاوی:۴/۸۸)

اگر قیام ممکن نہ ہو بقیہ چیزیں ممکن ہوں تو بیٹھ کر نماز پڑھ لے بعد میں اعادہ کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

(فتاوی ندوۃ العلماء:۳/۱۸۶)

بقیہ: مدینہ کے منافقین

.....، کونوں کھدروں میں دبکے رہنا اور ڈرتے ڈرتے پس پردہ رہ کر اوچھی حرکتیں کرنا ان کا شیوہ تھا، قرآن حکیم اس کی منظر کشی یوں کرتا ہے: ﴿فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ☆ وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنكُمْ وَمَا هُم مِّنكُمْ وَلَٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ ☆ لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ﴾ (تو ان کا مال اور ان کی اولاد آپ کو اچنبھے میں نہ ڈال دے اللہ یہی چاہتا ہے کہ اس کے ذریعہ ان کو دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور کفر ہی کی حالت میں ان کی جان نکلے، اور وہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم ہی میں ہیں وہ تم میں ہیں ہی نہیں البتہ وہ ڈرپوک لوگ ہیں، اگر ان کو کوئی پناہ کی جگہ یا غار یا گھس بیٹھنے کی کوئی جگہ مل جائے تو اسی کی طرف رسیاں توڑا کے بھاگیں)

(۶) سازشی ذہنیت؛ اس کے ذریعہ بلند کردار افراد کو گرانے کی کوشش کی جاتی تھی، تاکہ ان کا وقار ختم ہو، لیکن ہمیشہ منہ کی کھائی اور ذلت کی سیاہی ان ہی کے منہ پر پھری، ارشاد الٰہی ہے: ﴿لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِن قَبْلُ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ حَتَّىٰ جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَارِهُونَ﴾ (پہلے بھی وہ فتنہ کی تلاش میں رہے اور آپ کے کاموں میں الٹ پھیر کرتے رہے یہاں تک کہ سچا وعدہ آپہنچا اور اللہ کا حکم غالب ہوکر رہا اور وہ کڑھتے ہی رہ گئے)

رسول اللہ ﷺ نے منافق کو "الشاة العائرة" فرمایا ہے، یعنی وہ حیران وسرگرداں بکری جو جنسی آسودگی کے لیے کبھی یہاں کبھی وہاں ماری ماری پھرتی ہے، نفسانی اغراض کی تکمیل کے لیے منافق کہیں بھی کسی بھی پستی میں جاگرنے کو تیار رہتے تھے، زبان نبوت نے منافق کی جو مثال پیش کی اس سے بلیغ مثال کہیں اور نہیں مل سکتی، ایک روایت میں ہے: "آية المنافق ثلاث؛ اذا حدث كذب واذا وعد أخلف واذا اؤتمن خان" (منافق کی تین نشانیاں ہیں؛ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے)

اللہ کا پیغام اہل ایمان کے نام یہ ہے کہ وہ کسی صورت میں منافقین کی طرح نہ بنیں، چاہے اس کی جتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑے: ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (اور ان لوگوں کی طرح مت ہوجانا جنھوں نے اللہ کو بھلادیا تو اللہ نے ان کو ایسا بنادیا کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے وہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں)

علم دین کی اہمیت ونافعیت

محمد ارمغان بدایونی ندوی

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ تَعَلَّمَ عِلْماً مِمَّا يُبْتَغَى بِهِ وَجْهُ اللّٰهِ، لَا يَتَعَلَّمُهُ إِلَّا لِيُصِيبَ بِهِ عَرَضاً مِنَ الدُّنْيَا، لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَعْنِي رِيحَهَا. (سنن أبي داؤد: ٣٦٦٤)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس علم سے اللہ کی رضا چاہی جاتی ہو، انسان اس علم کو دنیا کی دولت کمانے کے لیے حاصل کرے تو ایسا شخص قیامت کے دن جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہے گا۔

فائدہ:- جس طرح انسانی جسم خون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، ٹھیک اسی طرح کوئی قوم علم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، قوموں کے عروج اور ان کے ارتقاء کا بنیادی راز علم سے وابستگی میں مضمر ہے، تاریخ شاہد ہے کہ جن قوموں نے علم سے اپنا رشتہ مضبوط کیا، وقت کی بڑی بڑی طاقتیں ان کے سامنے گرد ہوگئیں، یہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں انسانیت کو پہلا سبق تعلیم سے وابستہ رہنے کا سکھایا گیا، اس لیے کہ علم انسان کو زندگی گذارنے کا صحیح سلیقہ عطا کرتا ہے، مالک حقیقی سے رشتہ کو مضبوط کرنا سکھاتا ہے، آداب معاشرت عطا کرتا ہے، انسانیت نوازی کی تعلیم دیتا ہے، اور یہ وہ جوہر ہے جس کے سامنے انسانیت بیزار طاغوتی طاقتیں زیر ہوجاتی ہیں، قرن اول میں اس کی واضح مثالیں موجود ہیں۔

اسلام دین فطرت ہے، اس میں وہی تعلیمات ہیں جن سے انسانیت کو فروغ حاصل ہو، اور انسان اپنے رب کی یاد سے غافل نہ ہو، اس لیے حصول علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی بھی تاکید کی ہے کہ علم خواہ کیسا بھی ہو مگر اس کو خالق حقیقی کے نام سے جوڑ کر حاصل کیا جائے، تاکہ وہ علم خلق خدا کو فائدہ پہنچانے والا ہو، دلوں میں اللہ کی خشیت پیدا کرنے والا ہو، اور علم سے وابستہ افراد کو یہ پیغام دیتا ہو کہ علم کی دولت ہاتھ لگنے میں انسان کا اپنا کوئی کردار نہیں، بلکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا انعام ہے، چنانچہ خالق حقیقی کے نام کے ساتھ علم کے حاصل کرنے کی تعلیم دیتے ہوئے ارشاد ہوا: ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ (پڑھئے اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا) اسی طرح علم سے اللہ کی خشیت پیدا ہونے کے متعلق ارشاد ہے: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ (اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں)

جب سے دنیا قائم ہے نہ جانے کتنے علوم آئے اور بے نام و نشان ہوگئے، اسی طرح نہ جانے کتنے علوم آئیں گے اور مٹ جائیں گے، لیکن ایک علم وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ انسانیت کو ملا، اس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ باطل کی تیز وتند ہواؤں کے مقابلہ میں بھی باقی رہا اور تا قیامت باقی رہے گا، دنیا میں تنہا یہی وہ علم ہے جو مردہ دلوں کی مسیحائی کرتا ہے، ذرہ کو خورشید بناتا ہے، انسانیت کو اوج کمال تک پہنچاتا ہے، اس کے برخلاف دنیا کے دیگر علوم بھی گرچہ انسانیت کے نفع کے لیے ہیں، لیکن ان علوم کی تنگ دامانی انسانیت کی عالمگیر رہنمائی سے قاصر ہے۔

ترقی پسند دنیا کا المیہ یہ ہے کہ جس علم سے انسانیت کی بقا وابستہ تھی، اس کو ثانوی درجہ دے دیا گیا، اور جس علم کی بقا کا خود کوئی ثبوت نہیں، اس کو اول مقام دیا گیا، علم حقیقی سے وابستگی معاشرہ کے کمزور ترین افراد کی ذمہ داری سمجھی گئی، اس پر طرفہ تماشا یہ ہوا کہ خود علم حقیقی سے وابستہ افراد میں سے بھی ایک بڑی تعداد دنیاوی علوم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی، یہی وجہ ہے کہ فراغت علمی کے بعد اکثر حاملین علوم دین مغربی افکار سے متاثر اداروں میں داخل ہوتے ہیں، اور ان کی ثقافت سے متاثر ہوکر دینی علوم کے وقار کو مجروح کرتے ہیں، ظاہر ہے ایسے افراد سے ملت کے لیے کس نفع کی توقع کی جاسکتی ہے؟؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ دور میں علم دین کی اہمیت ونافعیت کو رضائے الٰہی کے حصول کا مقصد پیش نظر رکھتے ہوئے ثابت کیا جائے، مذکورہ حدیث میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص بھی علم دین سے منسلک ہوا، لیکن اس کی نیت میں فتور رہا، یعنی اس کی نیت دنیا طلبی کی ہوئی، انسانیت کے لیے اپنی نافعیت کو ثابت کرنے کی پرواہ نہیں ہوئی، اس علم سے تعلق کے بعد بھی اپنے رب کو راضی کرنے کی فکر لاحق نہ ہوئی تو اس کا انجام نہایت سنگین ہوگا، اور وہ جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہے گا۔

مسلم نسل کشی کا اندلسی ماڈل

محمد نفیس خاں ندوی

712ء سے 1492ء تک مسلمان اسپین کے حکمراں رہے، یہ تعمیری وتہذیبی ترقی کا سنہرا دور تھا، علوم وفنون اپنے عروج پر تھے، ایجاد ہو یا تعمیر، سائنس ہو یا تہذیب، مسلمانوں کا دنیا بھر میں کوئی ثانی نہ تھا، اس دور میں یورپ کی سب سے بڑی لائبریری میں محض چھ سو کتابیں تھیں جبکہ اسپین کے دارالحکومت قرطبہ کے خطاط ہر سال تقریباً چھ ہزار کتابیں تحریر کر رہے تھے، الحمرا پیلس مسلم فن تعمیر کا آج بھی ایک اعجوبہ مانا جاتا ہے، معاشرہ کا امن وامان مثالی تھا، پورے اندلس میں عیسائی اور یہودی اطمینان کے ساتھ تھے، اس دور میں اسلام اپنی بہترین تہذیب اور اعلی اقدار کی وجہ سے پورے مغرب میں سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب تھا۔

1492ء میں مسلم حکومت کے زوال سے مسلمانوں کو ایک نئی حقیقت کا سامنا کرنا پڑا، ایک خونیں تاریخ رقم ہوئی، اندلس پر 780 سالہ مسلم اقتدار کے شاندار دور کو یکسر فراموش کر دیا گیا، انہیں محکوم بنایا گیا اور پھر انہیں انتہائی وحشیانہ اور غیر انسانی سلوک میں مبتلا کر دیا گیا، انھیں زبردستی عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، اور عدم تعاون کی سزا موت یا جلاوطنی کی صورت میں دی گئی، اسے تاریخ کی بدترین نسل کشی کا نام دینا بے جا نہ ہوگا، یہ ایک ایسی نسل کشی تھی جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی، اندلس کے گلی کوچہ خون مسلم سے رنگ دیے گئے، اور لاکھوں لاکھ اندلسی مسلمانوں کو قصہ ماضی بنا دیا گیا، اور جو مسیحی تلواروں سے محفوظ رہے ان پر ملک بدری کا جبری حکم نافذ کیا گیا، خود ایک انگریز مؤرخ اعتراف کرتا ہے:

"Between 1609-14 an estimated 350,000 men,women, children were forcibly removed from their homes and deported from the country in what was then the largest removal of a civilian population in European history."

(۱۶۰۹ سے ۱۶۱۴ء تک تقریباً ساڑھے تین لاکھ مرد، عورت، بچے جبری طور پر اپنے گھروں سے نکال دیے گئے اور ملک بدر کر دیے گئے، یورپ کی تاریخ میں کسی آبادی کی یہ سب سے بڑی ملک بدری تھی)

مسلم نسل کشی کا اندلسی ماڈل آج بھی اہل مغرب کے لیے کامیابی کی دلیل سمجھا جاتا ہے، یہ حرمت اسلامی کی پامالی کے آغاز کا دور تھا جس نے آگے چل کر اس خاص مسلم کش رویے کو مزید جلا بخشی، مغرب میں اسلام سے نفرت کا اظہار کھلے بندوں ہونے لگا، صرف 1800ء سے 1950ء کے درمیانی عرصے میں مغرب میں انتہائی تسلسل کے ساتھ اسلام کے خلاف زہر اگلتی کتابیں تحریر کی گئیں، میڈیا کی ترقی ہوئی تو اسلام کے خلاف اشتعال انگیز خبریں شائع ہونے لگیں، اور مسلم منافرت کی فلمیں بھی بنائی جانے لگیں، یہ ایک مضبوط اور بھرپور میڈیائی پروپیگنڈہ کا دور تھا، اور اس کا بنیادی مقصد مغرب میں اسلام مخالف جذبات کو ابھارنا اور مسلمانوں کو ایک خوف ودہشت کی تصویر بنا کر پیش کرنا تھا، جسے اصطلاحی طور پر ''اسلاموفوبیا'' (Islamophobia) بھی کہا جاتا ہے۔

حیرت انگیز طور پر دنیا کو انسانیت کا درس دینے والے مغرب میں آج بھی 60 سے 70 فیصد تحریریں مسلم بیزاری اور اسلام دشمنی پر لکھی جاتی ہیں، قرآنی آیات اور اسلامی تعلیمات کو غلط تشریحات دے کر پھیلایا جاتا ہے، وقتاً فوقتاً ایک خاص منصوبے کے تحت مسلمانوں کی شہ رگ پر حملے کرنے کے لیے ناموس رسالت کی بے حرمتی جیسے اقدامات بھی کیے جاتے ہیں تاکہ مسلمانوں کو نفسیاتی طور پر کمزور کیا جا سکے، چنانچہ ان کی اعصاب شکنی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔

مغرب کی مسلم دشمنی کو پرکھنے کے لیے اٹلانٹا میں ہونے والے یہودیوں کے ایک بڑے مذہبی اجتماع میں ایک یہودی ربی Shalom کا یہ خطاب ہی اس کی بڑی عکاسی کا باعث ہے جو

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک کھلے اعلان جنگ کے طور پر دنیا کی سماعتوں سے ٹکرایا۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"ہمارا دشمن جو بظاہر انسانی چہرہ مہرہ رکھتا ہے لیکن درحقیقت اس کا دل، اس کی روح بالکل غیر انسانی ہے، یہ ایک ایسی بلا ہے، یہ ایک ایسی آفت ہے جو ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے، اس کی تعداد دنیا کی کل آبادی کا ایک بلین ہے جس کا 5 فیصد حصہ دنیا میں دہشت پھیلا رہا ہے۔ 5 فیصد کا مطلب 50 ملین مسلمان ہیں جو قرآن اٹھائے، منہ سے اللہ اکبر کے کلمات جاری کرتے ہمارے گلے کاٹ رہے ہیں۔ ہمیں ان سے نفرت ہے لیکن محض نفرت سے کام نہیں چلے گا، ہمیں ان کا قلع قمع کرنا ہوگا بغیر یہ سوچے کہ سب مسلمان دہشت گرد نہیں، ہمیں اسپین کی طرح انہیں جڑ سے اکھاڑنا ہوگا، ہمیں شکر گزار ہونا چاہیے کہ اسرائیل ہماری جنگ لڑ رہا ہے، ہمیں شکر گزار ہونا چاہیے کہ امریکہ ہمارا ساتھ دے رہا ہے، خدا اسرائیل اور امریکہ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے"۔

ایک معروف عیسائی جریدہ میں چھپنے والے مضمون کی چند سطریں بھی ملاحظہ ہوں:

"عیسائیوں کا مسلمانوں کے ساتھ امن سے رہنا ناممکن ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ ان مورز (Moors) یعنی مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنالیا جائے یا اپنے ملک سے باہر نکال پھینکا جائے، اگر ایسا ممکن نہیں تو تیسرا راستہ ان کی نسل کشی کا ہے۔"

مذکورہ مثالوں سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ انتہا پسند یہودی وعیسائی مسلم نسل کشی کے اندلسی ماڈل کو کس قدر قابل تقلید سمجھتے ہیں، اسی اندلسی ماڈل کی پیروی کرتے ہوئے مختلف ممالک میں مسلمانوں کے قتل عام یا ان کی نسل کشی کی مختلف کوششیں کی جاچکی ہیں۔

بوسنیا میں مسلمانوں کے صفایہ کی جو کوششیں کی گئیں اور ان کے خون سے جس طرح ہولی کھیلی گئی، ان واقعات نے کرب اور دل افگاری کے ناقابل بیان حالات کی داستان رقم کی ہے۔

سربوں نے تقریباً دو لاکھ نہتے مسلمانوں کو انتہائی وحشیانہ طریقے سے صفحہ ہستی سے مٹا ڈالا۔

افغانستان اور عراق پر امریکی جنگ میں بھی لاکھوں لوگ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

فلسطین میں 1948ء سے لے کر اب تک نہتے فلسطینی جوانوں، بوڑھوں، اور بچوں کی گرتی لاشیں مغرب اور عالمی مغربی اداروں کی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

برما میں بدھ مت قوم نے اپنے امن وآشتی کے مذہبی درس کو فراموش کر کے جس طرح مسلمانوں کو موت کے منہ میں دھکیلا، وہ بھی سب کے سامنے ہے۔

مغرب سے باہر نکل کر دیکھیں تو باقی غیر مسلم دنیا بھی اسی ماڈل کی گرویدہ دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے ملک میں ایک معروف انگریزی اخبار کے ایک غیر مسلم جرنلسٹ نے اپنے ایک مضمون کے ذریعے اس ماڈل کو عیاں کرنے کی جسارت کچھ اس طرح کی ہے:

"ہندوستان میں آریہ سماج، راما کرشنا مشن، وشوا ہندو پریشد اور اب بھارتیہ جنتا پارٹی نے مسلم نسل کشی کا اسپینی ماڈل اپنا رکھا ہے، یہ ہندو مسلم فسادات کی آڑ میں مسلم اقلیت کو ظلم وجبر کا نشانہ بناتے ہیں، انہیں اور ان کے گھر بار کو فسادات کی آڑ میں جلا دیا جاتا ہے، 5 فیصد مسلمان تو ہندو سماج کا حصہ بننے پر مجبور ہے لیکن 95 فیصد کا کوئی پرسان حال نہیں، یہ طبقہ انتہائی غربت اور پسماندگی کے ساتھ ساتھ انتہا پسندوں کے مظالم سہنے پر بھی مجبور ہے، یہاں مسلم سیاسی جماعتیں ہندو جماعتوں کا دم چھلا رہی ہیں، چند ایسے مسلم لیڈران ہیں جو مسلمانوں کی ثقافتی شناخت کا دفاع کرتے ہیں لیکن یہ لیڈران بھی اسلام کو تحفظ دینا چاہتے ہیں مسلمانوں کو نہیں۔"

ہندستان کی کئی ریاستوں مثلاً گجرات، بہار، احمد آباد، حیدر آباد وغیرہ میں مسلمانوں کی نسل کشی کے ان گنت واقعات ہو چکے ہیں، محض کشمیر میں ہی 1989ء سے لے کر اب تک ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کو بے دردی سے شہید کیا جاچکا ہے۔

ان تمام صورتحال پر ترقی یافتہ اور نام نہاد جمہوری معاشرے عجیب طرح کی چپی سادھے رہے، انہیں عیسائیوں، یہودیوں اور مشرکوں کی انتہا پسندی یا دہشت گردی ذرہ برابر بھی دکھائی نہیں دیتی، کبھی کبھی ہیمنت کرکرے جیسا بہادر آفیسر یا گوری لنکیش جیسی باضمیر صحافیہ حقائق کو طشت از بام کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو انھیں پراسرار طور پر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے امریکہ میں جب تین مسلم نوجوان ایک انتہا پسند

عیسائی کے ہاتھوں اپنی جان گنوا بیٹھے تو مغربی میڈیا کی اس واقعہ پر سادھی گئی خاموشی کو لتاڑتے ہوئے مسلم جیوش کرسچین الائنس کے فاؤنڈنگ ممبر مسٹر Kevin Barrett نے لکھا: "اس واقعہ پر خاموشی اختیار کر کے درحقیقت میڈیا بھی مسلمانوں کے قتل عام کا حصہ دار بن گیا ہے، ہماری انتہا پسند میڈیا دراصل دنیا کو یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے تحفظ کا کوئی اختیار حاصل نہیں، اب مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس نسل کشی کے خلاف اپنا دفاع کریں۔"

اعتدال پسند مغربی مفکرین کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ دنیا بھر میں جب بھی کوئی دہشت گردانہ واقعہ پیش آتا ہے تو ایک خاص منصوبہ بندی کے ذریعہ اسے مسلمانوں کی جانب منسوب کر دیا جاتا ہے، اور پھر اس واقعہ کا ایک ہی رخ مغربی معاشرہ اور باقی دنیا کے سامنے رکھا جاتا ہے تاکہ مسلمانوں کے خلاف اٹھائے جانے والے ہر اقدام کو مغربی عوام کی تائید حاصل رہے۔ اسی سازش کا حصہ ہے کہ خود اسلامی ملکوں میں بھی ایک خاص پڑھی لکھی سیکولر سوچ پیدا کر کے اسے مسلمانوں کی معاشرت اور تمدن کے خلاف شر انگیزی اور منافرت پھیلانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

یہ بہت ہی عجیب اور حوصلہ شکن بات ہے کہ اسلاموفوبیا یا مسلم نسل کشی کے خلاف خود مغرب میں بعض لوگ سوال اٹھاتے ہوئے پائے جاتے ہیں مگر ہمارے "روشن خیال مفکرین" اسے ایک فرسودہ اور خام خیالی پر مبنی سوچ قرار دیتے ہیں، اور مغرب کی اسلام دشمنی کو محض "شدت پسند مولویوں" کا ذہنی اختراع گردانتے ہیں، اس تناظر میں اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ہماری ہر کمزوری، ہر خامی اور ہر شکست کے لیے مغرب کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا اور ایک لمحہ کو یہ بھی مان لیں کہ ہماری پسماندگی اور ہمارے سنگین مسائل میں مغرب کا کوئی ہاتھ نہیں۔ پھر بھی مغرب کی اس دوہری پالیسی کی حقیقت اپنی جگہ موجود رہے گی جو کسی غیر مسلم ملک میں حملے کے وقت کچھ اور ہوتی ہے اور کشمیر، فلسطین یا شام میں بے گناہ، نہتے مسلمانوں کا خون بہہ جانے پر کچھ اور! اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم رہے گی کہ مسلمان مغرب کی عسکری، تہذیبی اور معاشی جارحیت کا شکار ہیں، اور کئی صدیوں سے ان کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔

آج مغربی طاقتیں اسلام کی نفرت میں اس قدر بڑھ چکی ہیں کہ وہ خود بھی ایک خاص ذہنی کیفیت اور اعصابی تناؤ کا شکار ہیں۔ درحقیقت انہیں مسلمانوں کی پھیلائی ہوئی "نام نہاد دہشت گردی" کا خوف نہیں بلکہ اسلام کے تیزی سے پھیلنے کا خوف لاحق ہے۔ اسلام جس قدر تیزی سے پھیل رہا ہے، یہ چیلنج مغرب کی راتوں کی نیند اڑا چکا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یوکے اور فرانس میں پچھلے دس برسوں میں تقریباً ایک لاکھ افراد نے اسلام قبول کیا ہے۔ جرمنی و امریکہ میں ہر سال تقریباً 20 ہزار افراد اسلام قبول کر رہے ہیں، ممکن ہے کہ اعداد وشمار میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار کی بالکل گنجائش نہیں کہ 9/11 کے واقعہ کے بعد مغربی معاشرہ میں اسلام کے مطالعہ کی عمومی فضا قائم ہوئی ہے، اور بہت سے لوگوں نے اسلام کے خلاف مغربی پروپیگنڈہ کے ردعمل میں اسلام کا مطالعہ شروع کیا، اور مختصر سی مدت میں اسلام کے نام لیوا بن گئے۔

بلاشبہ مغرب کے جارحانہ و پرتشدد رویہ کا منطقی جواب پرتشدد ہی ہونا چاہیے لیکن چونکہ اسلام امن پسندی کا عملی دعویدار ہے اور مسلمانوں کا وجود امت دعوت کی حیثیت سے ہے اس لیے کسی بھی پرتشدد اور غیر انسانی طریق کو اختیار کرنا اسلام کی نظر میں سنگین جرم ہے، اس لیے مغرب کی طرح پرتشدد راستوں پر چلنے کے بجائے اس کا مقابلہ جرأت ایمانی، مؤثر وسائل اور ٹھوس دلائل کے ذریعہ کرنا ہوگا، اور اس کے لیے سب سے پہلے خود کو مجرم یا کمزور سمجھنے کی ذہنیت کو ختم کرنا ضروری ہے۔

اگر ہم آج کسی سازش کا شکار ہیں تو اس سازش کے کامیاب ہونے میں کسی حد تک ہماری کوتاہیوں کو بھی دخل ہے، ہم بڑی حد تک احساس کمتری کا شکار ہیں اس لیے اپنے آپ کو کوسنے کے بجائے ایک نئے احساس میں داخل ہونے کی ضرورت ہے؛ اور وہ ہے خود اعتمادی، اسلامی ثقافت وتمدن پر فخر وسکون، اور روحانی طور پر اسے قبول کر کے اسی کی روشنی میں اپنے نئے کردار تخلیق کرنا۔ اسی کے ذریعے مسائل کے حل کی جدید اور قابل قبول راہیں دریافت ہو سکیں گی اور اسی کے ذریعے گمراہ لوگوں کو جو متشدد راستوں کو اپنی نجات بنا چکے ہیں، جو بہکاوے میں آ کر اپنا اور اپنوں ہی کا لہو بہانے لگے ہیں، ان کی بھی اصلاح ہو پائے گی، اور سب سے بڑھ کر مغرب کی جارحانہ پالیسیوں اور متعصب پروپیگنڈوں کا سدباب ممکن ہو سکے گا۔

ہماری مشکلات اوران کا حل

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

آج مسلمان ہراس اور بے چین ہیں، میں عرض کروں گا کہ یہ امور اسلام کے خلاف نہیں ہیں، ہمیشہ ایسے مظالم اسلام پر ہوتے رہے ہیں، جناب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام پر برابر ایسے پہاڑ توڑے گئے، اسلام کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے، مکہ معظّمہ کے مشرک، مدینہ منورہ کے منافقین و یہود، دیگر ممالک کی غیر مسلم اقوام ہمیشہ اسی قسم کے اعمال کرتی رہیں جن کی نسبت پہلے ہی سے اشارہ نہیں بلکہ تصریح کردی گئی تھی۔

"لتبلون فی أموالکم و أنفسکم" (تم ضرور بالضرور آئندہ کو اپنے مالوں اور جانوں میں آزمائے جاؤ گے) اور اسی قسم کی دیگر آیتیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو جو مظالم آج لوگ اسلام پر ڈھا رہے ہیں، وہ ہر زمانہ میں خدا کے سچے اور حقانی بندوں کے ساتھ کیے گئے ہیں۔

جناب رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ "أوذیت مالم یؤذ نبي" (جس قدر مجھ کو تکلیفیں پہنچائی گئیں کسی نبی کو نہیں پہنچائی گئیں) باوجود ان امور کے ہمیشہ غالب ہو کر رہے۔

آج ہم کو بھی وہی طرز اختیار کرنا ضروری ہے جو جناب رسول اللہ ﷺ نے اختیار کیا، اور یہی ظفر مندی کے طریقے ہیں، لہٰذا مندرجہ ذیل تجاویز پر بہت جلد عمل درآمد ہونا ضروری ہے۔

۱-نماز اور جماعت کی پوری پابندی۔۲-ہر محلّہ اور ہر بستی میں کوشش کی جائے کہ کوئی شخص بے نمازی نہ رہے۔۳-شریعت کے جملہ امور کی پابندی۔۴-تعلیم کو جس میں مذہبی ضروریات اور بنیادی لوازم ہوں نہایت عزم کے ساتھ اشاعت کی جائے اور بکثرت مدارس و مکاتب قائم کیے جائیں۔۵-بیاہ شادی کی فضول خرچیاں یک قلم بند کردی جائیں۔۶-غمی کے لیے قوانین بنائے جائیں تاکہ ان میں قرض داری کی نوبت نہ آئے۔۷-مقدمہ بازی بند کردی جائے۔۸-لڑکوں اور لڑکیوں کے جوان ہوتے ہی بیاہ کردیا جائے۔۹-بیوہ عورتوں کو حتی الوسع بلا شادی نہ چھوڑا جائے۔۱۰-بچپن کی شادی ترک کردی جائے۔۱۱-ہر قسم کی تجارت کے شعبوں میں مسلمان مکمل حصہ لیں۔۱۲-سودی قرض بند کردیا جائے۔۱۳-مسلمانوں میں آپس کے اختلافات دور کردیے جائیں اور ۱۴-ہر جگہ والینٹیر کوریں قائم کی جائیں۔

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Postal Reg. No.
RBL/NP -19

Volume: 09 DECEMBER 2017 Issue: 12

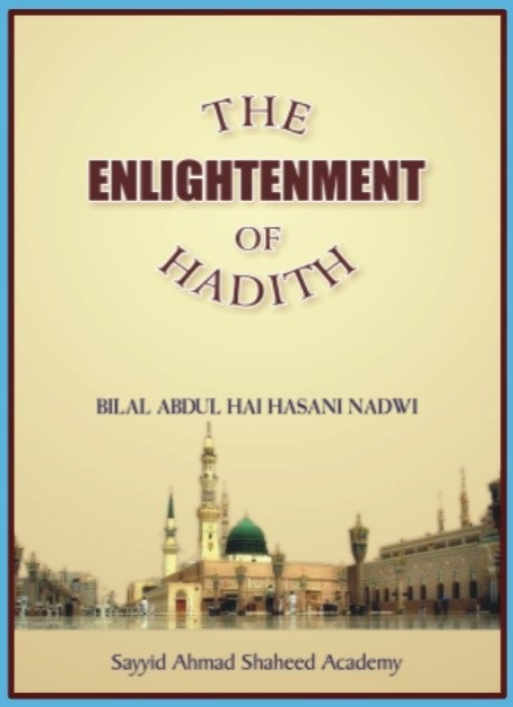

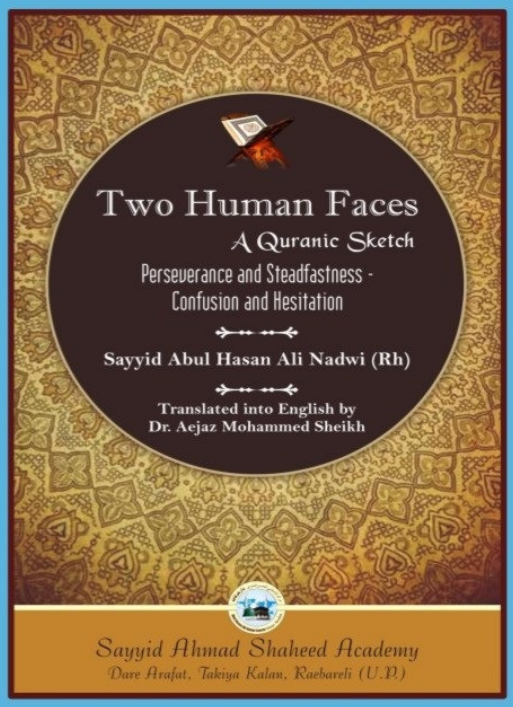

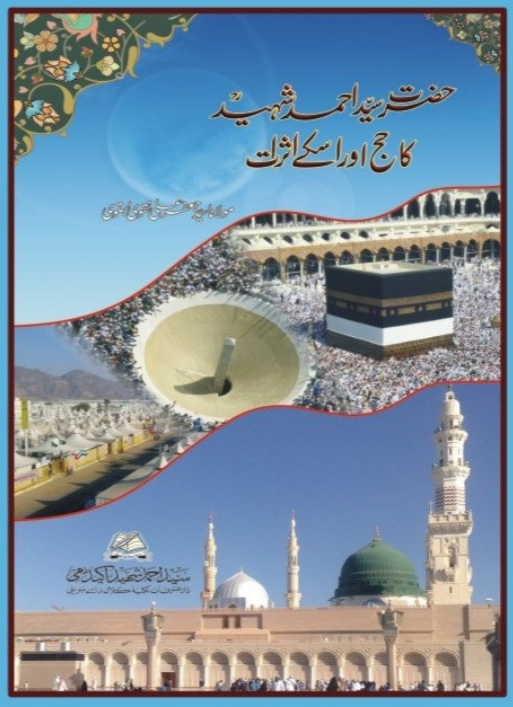

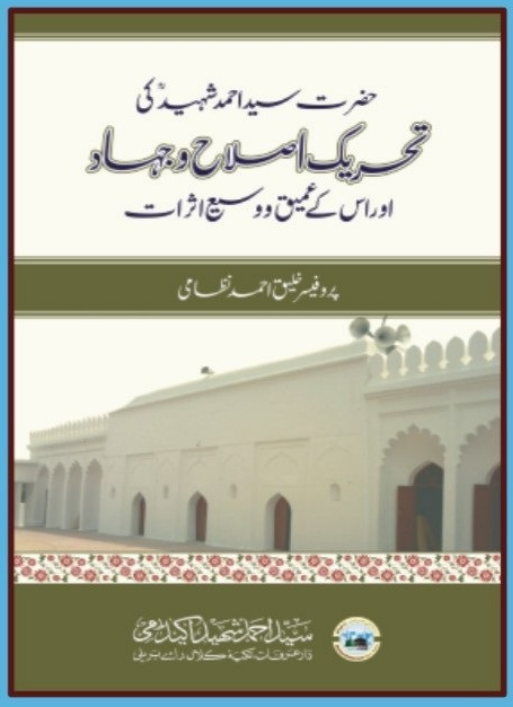

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9565271812
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)